رجب المرجب ۱۴۴۶ھ
جنوری ۲۰۲۵ء

# ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات

## تنظیمِ اسلامی

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

- موت: ایک اٹل حقیقت!
- حیا بمقابلہ بے حیائی
- ذِلّت و رسوائی کا سبب: ترکِ قرآن


داعیٔ رجوع الی القرآن، بانیٔ تنظیم اسلامی
ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ
کے دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیانُ القرآن

ترجمہ و مختصر تفسیر
کی شہرۂ آفاق پذیرائی اور مقبولیت کے بعد اب پیش ہے:

امپورٹڈ میٹ پیپر ❁ مضبوط مراکو جلد ❁ 1248 صفحات

~~4500/-~~ روپے کے بجائے
صرف -/2200 روپے میں

فری ہوم ڈیلیوری کے ساتھ

رمضان پیکج کے تسلسل میں

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور
36-K، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)
maktaba@tanzeem.org
0301-1115348

وَاذۡکُرُوۡا نِعۡمَۃَ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ وَمِیۡثَاقَہُ الَّذِیۡ وَاثَقَکُمۡ بِہٖۤ ۙ اِذۡ قُلۡتُمۡ سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا ۫ (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

# ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ


| | | |
|---|---|---|
| جلد | : | 74 |
| شمارہ | : | 1 |
| رجب المرجب | | 1446ھ |
| جنوری | | 2025ء |
| فی شمارہ | : | 50روپے |
| سالانہ زرِ تعاون | : | 500روپے |



مُدیر
حافظ عاکف سعید

مجلسِ ادارت:
ایوب بیگ مرزا، خورشید انجم

نائب مُدیر
حافظ خالد محمود خضر

ادارتی معاون:
حافظ محمد زاہد، محمد خلیق



مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقامِ اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700 ، فون: 3-35869501

ای میل: maktaba@tanzeem.org، 0301-1115348

ترسیلِ زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

رابطہ برائے ادارتی امور: (042)38939321

publications@tanzeem.org

ویب سائٹ: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: ”دارُالاسلام“ ملتان روڈ چوہنگ لاہور

(پوسٹل کوڈ53800) فون: 78-(042)35473375

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ




## مشمولات


عرضِ احوال ——— 5

شام: ماضی، حال اور مستقبل — ادارہ

بیانُ القرآن ——— 10

سُورۃُ الْعصر تا سُورۃُ الْکَوْثَر — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

تذکرہ و تبصرہ ——— 25

موت: ایک اٹل حقیقت! — اعجاز لطیف

مراقبۂ موت ——— 41

ایک دن مرنا ہے، آخر موت ہے! — خواجہ عزیز الحسن مجذوبؒ

حسنِ معاشرت ——— 43

حیا بمقابلہ بے حیائی — ریان بن نعمان

دعوت وعزیمت ——— 60

منظّم مسلّح جدّوجُہد:
تاریخِ اسلامی کا اِک درخشاں باب — حذیفہ محمود

اعتصامش کُن ——— 65

ذِلت ورسوائی کا سبب: ترکِ قرآن — حافظ محمد اسد

اقوامِ عالَم ——— 71

عربوں کی طبقاتی تقسیم — حافظ محمد قاسم رضوان

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

# شام: ماضی‘ حال اور مستقبل

شام میں ۵۴ سال سے جاری کاٹ کھانے والی آمریت کا بالآخر خاتمہ ہوا اور ہیئت تحریر الشام نامی جماعت نے شام کا کنٹرول عارضی طور پر سنبھال لیا ہے۔ ابتدائی تعارف کے طور پر عرض ہے کہ ہیئت تحریر الشام مختلف عسکری‘ سیاسی و مذہبی تحریکوں کا مجموعہ ہے جو اپنی آزادی اور حقوق کی جِدّوجُہد میں طویل عرصہ سے غاصب نصیری حکومت کے خلاف برسرِ پیکار تھا۔ روس کی وزارتِ خارجہ کے مطابق شامی صدر بشار الاسد پُرامن انتقالِ اقتدار کے احکامات جاری کرنے کے بعد اپنے عہدے سے دست بردار ہوئے اور ملک چھوڑ دیا۔ شام میں اقتدار کی اس اچانک اور حیران کن منتقلی کے بعد جہاں دنیا بھر کے میڈیا میں مختلف النوع تبصرے اور تجزیے ہو رہے ہیں وہاں ہمارے ملک کے دانشور اور تجزیہ نگار بھی قیاس آرائیوں میں مصروف ہیں۔ ایک بڑی اکثریت کا غالب گمان یہی ہے کہ اس رجیم چینج کے پیچھے امریکہ اور اسرائیل کا ہاتھ ہو سکتا ہے اور اس کا سب سے زیادہ فائدہ بھی انہی دو قوتوں کو ہوگا۔ ۷/اکتوبر ۲۰۲۳ء کو جب حماس نے طوفان الاقصیٰ کا آغاز کیا تھا تو اس وقت بھی اکثریت کا تجزیہ یہی تھا کہ اس کے پیچھے اسرائیلی سازش ہو سکتی ہے‘ جو اس کا خوب فائدہ اُٹھاتے ہوئے پورے فلسطین پر قبضہ کر کے فلسطینیوں کا خاتمہ کر دے گا‘ وغیرہ۔ لیکن ایک سال سے زائد عرصہ گزرنے کے باوجود اسرائیل ابھی تک اپنے اہداف حاصل کرنے میں نہ صرف ناکام ہے بلکہ پوری دنیا میں اس کو ذلت اور رسوائی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے جبکہ اس کے مقابلے میں حماس اور فلسطینیوں کی حمایت میں پوری دنیا نے آواز بلند کی ہے۔ طوفان الاقصیٰ نے مسئلہ فلسطین کو دنیا میں گویا دوبارہ زندہ کر دیا ہے۔ جو ممالک فلسطین کو تسلیم نہیں کر رہے تھے‘ اب انہوں نے بھی اسے تسلیم کر لیا۔

شام میں اقتدار کی منتقلی کے پس پردہ ارادۂ خداوندی کیا ہے‘ یہ تو آنے والا وقت ہی ثابت کرے گا۔ تاہم سوال یہ بھی ہے کہ اگر شام پر باغیوں کے قبضہ سے امریکہ اور اسرائیل فائدہ اُٹھائیں گے تو بشار حکومت نے یہ موقع انہیں طشتری میں رکھ کر کیوں پیش کر دیا؟ ۲۰۱۱ء اور ۲۰۱۶ء کی خانہ جنگی کے پس پردہ امریکہ اور اس کے اتحادیوں کا کردار نمایاں تھا۔ اس وقت بشار حکومت نے بغاوت کو کچلنے میں پوری قوت صرف کی اور روس‘ ایران سے بھی مدد لی‘ لیکن اس مرتبہ روس‘ ایران اور خود بشار انتظامیہ نے



کوئی مزاحمت کیوں نہ کی؟ امریکہ اور اسرائیل کو محفوظ راستہ کیوں دے دیا؟

سوویت یونین کے خلاف امریکہ اور افغان مجاہدین مل کر لڑے۔ پھر نائن الیون کے بعد افغان طالبان امریکہ کے خلاف ۲۰ سال تک لڑے اور افغانستان میں اپنی حکومت بنائی۔ کیا بعید ہے کہ شام میں اپنی آزادی اور حقوق کے لیے لڑنے والے مختلف مسلم دھڑے مل کر ایک مشترکہ حکومت بنا لیں؟ سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ اگر باغیوں کی پشت پناہی امریکہ یا ترکی کر رہا ہے تو کیا بشار حکومت کی پشت پناہی فرانس‘ روس‘ ایران اور خدانخواستہ اسرائیل اور امریکہ در پردہ یا بالواسطہ نہیں کر رہے تھے؟ کیا وجہ تھی کہ جنوری ۲۰۱۰ء میں جیفری فیلٹ مین (Jeffery Feltman) نے‘ جو کہ امریکی وزارتِ خارجہ کا ڈپٹی سیکریٹری آف سٹیٹ تھا‘ واشنگٹن کے ہڈسن انسٹیٹیوٹ میں برملا کہا تھا کہ اسرائیل کسی طور پر بھی بشار الاسد حکومت کا خاتمہ نہیں چاہتا‘ اس لیے کہ اسرائیل ہی تو وہ ملک ہے جس نے بشار الاسد کو عالمی تنہائی سے نکالنے کے لیے دروازے کھلوائے۔ آخر کیا وجہ تھی کہ اسرائیل بشار حکومت کا خاتمہ نہیں چاہتا تھا اور شدید خانہ جنگی کے باوجود بشار حکومت ختم نہ ہو سکی تھی‘ مگر اب اچانک راتوں رات اقتدار کی منتقلی کیسے ہو گئی؟ سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ اگر بشار حکومت کے خاتمہ سے امریکہ اور اسرائیل فائدہ اُٹھائیں گے تو کیا بشار حکومت کے دوران انہوں نے کوئی فائدہ نہیں اُٹھایا؟ جیفری فیلٹ مین نے کہا کہ بشار الاسد اسرائیل کو اس لیے عزیز ہے کیونکہ اسد خاندان نے ۱۹۷۴ء سے اب تک اسرائیل کو ہمیشہ سکون کا سانس لینے دیا ہے۔ اس دوران اسرائیل نے نہ صرف گولان کی پہاڑیوں پر اپنا قبضہ مضبوط کیا‘ بلکہ اسے اسرائیل میں شامل بھی کر لیا۔ نیز یہ کہ حافظ الاسد نے اسرائیل کو یقین دلایا کہ حزب اللہ اور اسرائیل کی جنگ کو وہ عرب اسرائیل جنگ میں بدلنے نہیں دے گا۔ اور پھر ایسا ہی ہوا۔

گویا نصیری حکومت نے اسرائیل کے لیے سہولت کاری کی‘ اپنے دورِ اقتدار میں صرف مسلمانوں کو کمزور کیا اور جب اسرائیلی جارحیت کے خلاف ڈٹ کر لڑنے کا وقت آیا تو اس کے لیے میدان خالی چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ پھر یہ کہ نصیریوں کے قبضہ کے بعد شامی مسلمانوں پر ڈھائے گئے مظالم کیا فلسطین پر اسرائیلی قبضہ کے بعد وہاں کے مسلمانوں پر ڈھائے گئے مظالم سے کم ہیں؟ کیا نصیری افواج نے شام میں مسلمانوں کا بے دردی سے قتل عام نہیں کیا؟ کیا ٹارچر سیلوں میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں نہیں ہوئیں؟ کیا مسلمانوں کے خلاف کیمیائی ہتھیاروں کا استعمال نہیں کیا گیا؟ یاد رہے اگست ۲۰۱۳ء میں دمشق کے قریب شامی حزب اختلاف کے زیر قبضہ علاقے ’’غوطہ‘‘ میں کیے گئے ایک کیمیائی حملے میں (جس میں نروایجنٹ سارین شامل تھی) ۱۴۰۰ سے زیادہ مسلمان شہید ہوئے۔ یہ معاملہ میڈیا کی زینت بنا‘ پوری دنیا نے بشار الاسد پر تنقید کی اور بین الاقوامی دباؤ اور دھمکیوں کے تحت بشار الاسد کیمیائی ہتھیاروں کے ذخائر کو ختم کرنے پر رضامند ہوئے۔ OPCW کے کیمیائی ہتھیاروں کے معاہدے پر

دستخط کیے جس کے بعد شام میں ۱۳۰۰ ٹن کیمیکل کو تباہ کیا گیا۔ تاہم عالمی اداروں کے مطابق ملک میں کیمیائی ہتھیاروں کے حملے جاری رہے۔ رپورٹس کے مطابق ۲۰۱۴ء سے ۲۰۱۸ء کے دوران صرف چار سال کے عرصہ میں شام میں مسلمانوں کے خلاف ۱۰۶ مہلک کیمیائی حملے کیے گئے۔ علاوہ ازیں بدنامِ زمانہ صیدنایا جیل میں مسلمانوں پر ڈھائے گئے مظالم کی داستانیں بھی اب یہ ثابت کر رہی ہیں کہ شام پر نصیری قبضہ کسی طرح بھی اُمّتِ مُسلمہ کے لیے فلسطین پر اسرائیلی قبضہ سے کم نقصان دہ نہ تھا۔ جب حقائق یہ ہیں تو پھر ہمیں دیانتدارانہ طور پر سوچنا چاہیے کہ شام‘ شامی عوام اور اسلام کے حق میں دونوں میں سے بہتر کون ہے؟ نصیری اقتدار یا پھر شامی عوام کی حکومت؟ اس کے ساتھ یہ حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ شام کی بربادی کا اصل ذمہ دار کون ہے؟

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ شام ایک مسلمان ملک ہے جس کی ۹۰ فیصد آبادی سُنّی مسلمانوں پر مشتمل ہے‘ لیکن ۵۴ سال سے اس پر اسلام دشمن نصیریہ گروہ سے تعلق رکھنے والا خاندان جبراً بلکہ اسلام دشمن قوتوں کی مدد سے مسلط تھا جو اہلِ تشیع اور اہلِ سُنّت دونوں کے نزدیک مسلمان ہی نہیں ہے۔ نصیریوں کی ابتدا ایک گمراہ شخص محمد بن نصیر سے ہوئی جو کہ فارسیُ النّسل عراقی تھا۔ اس نے نبوت کا جھوٹا دعویٰ کیا اور دسویں صدی عیسوی میں اس دین کی ترویج عراق میں شروع کی۔ اکثر مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ نصیریہ فرقہ اصل میں گمراہ عیسائیوں کا ہی ایک گروہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ آج تک عقیدۂ تثلیث کو بھی مانتے ہیں اور دیگر عیسائی رسومات کے ساتھ کرسمس اور ایسٹر کے تہوار بھی مناتے ہیں۔ ۱۴ویں صدی عیسوی میں مجددِ وقت امام ابن تیمیہؒ نے ان کے کافر ہونے اور ان کے جان و مال کے مباح ہونے کا فتویٰ صادر کیا۔ ایسے فتاویٰ صرف ان کے کفریہ عقائد و نظریات کی وجہ سے نہ تھے بلکہ مسلمانوں سے ان کا بغض و عناد آخری حد تک پہنچا ہوا تھا۔ ۱۹ویں صدی میں ان کے درمیان وقت گزارنے والے ایک عیسائی پادری ریونڈ سیموئیل لائڈ کے مطابق یہ اہلِ سُنّت کے سخت دشمن اور جنگلی صفت لوگ ہیں۔ قتل و غارت‘ دھوکا‘ لوٹ مار ان کی سرشت میں شامل ہے۔ ان کی یہی خصلت شام میں ان کے اقتدار کے دوران بھی سامنے آئی۔ شام کی اکثریت سول و سرکاری اداروں‘ حکومت اور معیشت میں اپنا حق چاہتی تھی‘ لیکن یہ چند فیصد آبادی والا اقلیتی گروہ ۹۰ فیصد آبادی کو ان کے جائز حقوق دینے کے لیے تیار نہیں تھا اور یہی شام میں خانہ جنگی کی بنیادی وجہ تھی۔

ایک اقلیتی گروہ جو مسلمان بھی نہیں تھا‘ ایک مسلم اکثریت والے ملک پر جبراً کیسے قابض ہو گیا؟ تاریخ سے ہم اس کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کریں تو معلوم ہو گا کہ شام کا یہ نصیری علوی گروہ اپنی ابتدا سے ہی یہود و نصاریٰ کے مقاصد پورے کرتا چلا آ رہا ہے۔ پہلی صلیبی جنگ (۱۰۹۹ء) میں علویوں نے شام کی ساحلی پٹّی پر صلیبیوں کو قدم جمانے میں مدد دی‘ جس کے نتیجے میں انہوں نے بیت المقدس



مسلمانوں سے چھین کر اس پر قبضہ کر لیا۔ انعام کے طور پر صلیبی فوج نے نصیری علویوں کو شام کے وہ قلعے واپس کر دیے جو اسماعیلیوں نے ان سے چھینے تھے۔ یہ ان کا شام پر قبضے کا پہلا قدم تھا۔ اس کے بعد اسلام دشمن طاقتوں کے ساتھ مل کر ان کا ہر قدم شام پر قبضہ کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ ۱۲۵۸ء میں جب ہلاکو خان شام پر حملے کی تیاری کر رہا تھا تو یہی نصیری تھے جنہوں نے اس کی حمایت حاصل کرنے کے لیے شام پر اُس کا قبضہ مستحکم کرایا۔ اس جرم پر سلطان بیبرس نے نہ صرف انہیں سزا دی بلکہ ان کے علاقوں میں مساجد اور مدرسے بنوائے تاکہ نصیری اسلامی تعلیمات سے بہرہ مند ہو کر اسلام میں داخل ہو جائیں‘ لیکن مشہور مؤرخ ابن بطوطہ ۱۳۲۶ء میں جب ان کے علاقے سے گزرے تو انہوں نے لکھا کہ نصیریوں نے ان مساجد و مدارس کو باقاعدہ اصطبل میں بدل کر گھوڑے باندھے اور اسلام کی بے حرمتی کی۔

مسلمان مؤرخین امام ابن کثیر و ابن بطوطہ نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ اسی قبیلے کے ایک شخص نے ۱۳۱۷ء کے لگ بھگ مہدی ہونے کا اعلان کیا اور شام میں نہتے مسلمانوں کا قتلِ عام کیا‘ مسلم خواتین کی عزّتیں پامال کیں‘ جس پر مصر کے سلطان الملک الناصر نے نصیریوں کے قتلِ عام کا حکم دیا۔ اس کے نتیجہ میں وقتی طور پر یہ فتنہ دب گیا لیکن پس پردہ خلافت کے نظام کے خلاف دشمنوں کا مستقل آلۂ کار بنا رہا۔ خلافت عباسیہ کی طرح خلافتِ عثمانیہ کو بھی یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ لہٰذا ۱۵۱۴ء میں جنگ چلدرن میں انہوں نے عثمانیوں کے مقابلے میں صفویوں کا ساتھ دیا اور ان کے لیے جاسوسی کے فرائض سرانجام دیے۔ یہاں تک کہ کئی نصیری بھیس بدل کر عثمانی اداروں میں اعلیٰ عہدوں تک پہنچے اور یہود و نصاریٰ کے ساتھ مل کر خلافتِ عثمانیہ کے خاتمے کی راہ ہموار کی۔ انہی میں سے ایک امین وحید آفندی تھا جو ۱۸۰۶ء میں فرانس میں عثمانیوں کا سفیر بنا اور پھر فرانس کو شام پر قبضے کی رغبت دلائی۔ دوسری طرف خلافتِ عثمانیہ کے خلاف اُٹھنے والی ہر بغاوت میں یہ پیش پیش رہے۔ اسی کے نتیجے میں ۱۸۱۷ء میں بھی ترپیولی (لبنان) کے عثمانی گورنر بربر کے ہاتھوں انہیں عبرت ناک سزا ملی۔ اس کے باوجود ۱۸۲۹ء میں انہوں نے قبرص پر قبضہ کے لیے یونانیوں کا ساتھ دیا۔ انہی سرگرمیوں کی وجہ سے یہ قبیلہ اور اس کا علاقہ صلیبیوں اور صہیونیوں کے لیے پُرکشش آماج گاہ بن گیا۔ یہاں تک کہ امریکی عیسائی مشنریوں نے سرِعام وہاں اپنے ادارے قائم کر لیے۔ ان عیسائی مشنریوں کے عزائم بھانپتے ہوئے سلطان عبدالحمید دوم (۱۸۴۲ء-۱۹۱۸ء) نے ان پر پابندی عائد کر دی اور نصیریوں کو ایک بار پھر قومی دھارے میں شامل کرنے کے لیے ان کے علاقوں میں مساجد اور مدارس بنوائے۔ ان مساجد اور مدارس کا انجام بھی وہی ہوا جو اس سے پہلے سلطان بیبرس کی کوششوں کا ہو چکا تھا کہ ان میں گھوڑے اور جانور باندھے گئے اور بے حرمتی کی گئی۔

ایک طرف تو خلافتِ عثمانیہ کے خاتمے اور اُمّت کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے بدترین غداروں کو مسلط

کرنا اسلام دشمن قوتوں کا دیرینہ منصوبہ تھا‘ دوسری طرف نصیریوں کا بھی شام میں اپنی ریاست قائم کرنے کا دیرینہ خواب تھا جو اب پورا ہونے والا تھا۔ لہٰذا انہوں نے خلافتِ عثمانیہ کے خاتمہ کے لیے دشمنوں کے ساتھ ہر ممکن تعاون کیا۔ یہاں تک کہ انہی نصیریوں کی مدد سے ۱۹۱۸ء میں فرانس کی فوجیں شام میں داخل ہوگئیں اور ان کی مدد سے ہی شام کے کئی علاقوں پر قبضہ کرلیا۔ انہی خدمات کے بل بوتے پر ۱۹۱۹ء میں ۳۷ نصیری سرداروں نے فرانسیسی حکومت کو ایک ٹیلی گرام میں فرانس سے وفاداری کی یقین دہانی کراتے ہوئے مطالبہ کیا کہ چونکہ ہم مسلمانوں سے الگ قوم ہیں لہٰذا ہمیں الگ ریاست عطا کی جائے۔ چنانچہ جنگ عظیم اول کے خاتمہ پر فرانس و برطانیہ کے مابین بدنام زمانہ ’’سائکس پیکو‘ معاہدے کے تحت شام کو فرانس کے قبضے میں دے کر اس کو مختلف ٹکڑوں میں بانٹ دیا گیا اور ایک ٹکڑے کا نام ’الاذقیہ‘ رکھ کر اسے نصیری ریاست قرار دے دیا گیا۔

اس ٹیلی گرام پر دستخط کرنے والے نصیری سرداروں میں بشارالاسد کا دادا سلیمان الاسد بھی شامل تھا۔ بعدازاں فرانس نے شامی علاقوں پر اپنا قبضہ برقرار رکھنے کے لیے ’’سیرین سپیشل آرمی‘‘ کے نام سے ایک فوج تشکیل دی جس میں خاص طور پر نصیری علویوں کو بھرتی کیا گیا۔ بعدازاں اسی فوج کی مدد سے حافظ الاسد شام کے اقتدار پر قابض ہوگیا‘ اور مسلمانوں کو کچلنے اور کمزور کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ حقیقت میں کفار کا یہ منصوبہ تھا کہ وہ شام جس کی احادیث میں فضیلت بیان ہوئی اور اہلِ ایمان کا گھر قرار دیا گیا‘ جہاں امام مہدیؒ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام آ کر دجال کے خلاف لڑیں گے اس کو تقسیم کر کے ایک حصہ پر خود صہیونیوں کو مسلط کر دیا جائے اور باقی حصوں پر اُمت کے دیرینہ دشمنوں اور قادیانیوں کی طرح باطل دین بنانے والوں کو مسلط کر دیا جائے تاکہ یہ علاقہ اہلِ ایمان کا گھر نہ بن سکے۔ مگر ایک منصوبہ کُفار بناتے ہیں اور ایک منصوبہ اللہ تعالیٰ کا ہے۔ لہٰذا جو منصوبہ اللہ تعالیٰ کا ہے وہی آخر پورا اور کامیاب ہوتا ہے۔

شام کو اہلِ ایمان اور جہاد کا مرکز بن کر رہنا ہے‘ کیونکہ وہیں پر دجال اور اس کے حمایتی لشکروں کو شکست فاش ہوگی اور وہ دائمی جہنم کا ایندھن بنیں گے‘ ان شاء اللہ۔ ان حالات میں پاکستان کے مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اپنے ملک میں اسلام کے قیام کے لیے جدّوجُہد کریں تاکہ جب احادیث کے مطابق امام مہدی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائیں تو ہم بھی ان کے اسلامی لشکر میں شامل ہوسکیں۔ یہ تب ہی ممکن ہوگا جب یہاں اسلام کا غلبہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں دجال کے مقابلے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مہدی کے لشکر میں شمولیت کا اہل بنائے۔ آمین!

میثاق‘ حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن
تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجیے۔

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

# سُوْرَۃُ الْعَصْرِ

## تمہیدی کلمات

سورۃ العصر قرآن مجید کی مختصر ترین اور جامع ترین سورتوں میں سے ہے۔ اس کی جامعیت کے بارے میں امام شافعی ؒ کے درج ذیل دو اقوال بہت اہم ہیں:

(۱) لَوْ لَمْ یُنَزَّلْ مِنَ الْقُرْآنِ سِوَاھَا لَکَفَتِ النَّاسَ ”اگر قرآن مجید میں سوائے اِس (سورۃ العصر) کے کچھ اور نازل نہ بھی ہوتا تو لوگوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے یہی کافی ہوتی۔“

(۲) لَوْ تَدَبَّرَ النَّاسُ ھٰذِہِ السُّوْرَۃَ لَوَسِعَتْھُمْ ”اگر لوگ تنہا اسی ایک سورت پر غور کریں تو یہ ان کے لیے کافی ہو جائے۔“

یہ سورت ”مطالعہ قرآن حکیم کے منتخب نصاب“ کا نقطۂ آغاز بھی ہے۔ یعنی ہمارے منتخب نصاب کا پہلا درس سورۃ العصر کے بارے میں ہے۔ اس سورت پر میری ایک کتاب اور ایک مختصر کتابچہ بھی موجود ہے۔ تفصیلی معلومات کے لیے ان سے استفادہ کرنا مفید رہے گا۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

وَ الْعَصْرِ ﴿۱﴾ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ﴿۲﴾ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ۬ وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ﴿۳﴾

**آیت ۱** ﴿وَالْعَصْرِ ﴿۱﴾﴾ ”زمانے کی قسم ہے۔“

یعنی اس حقیقت پر زمانہ گواہ ہے یا پوری تاریخ انسانی شاہد ہے کہ:

**آیت ۲** ﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ﴿۲﴾﴾ ”یقیناً انسان خسارے میں ہے۔“



اگلی آیت میں اس نقصان اور خسارے سے بچاؤ کے لیے چار شرائط بتائی گئی ہیں، لیکن ان میں سے کوئی ایک یا دو یا تین شرائط پوری کر دینے سے مذکورہ خسارے سے بچنے کی امید نہیں کی جا سکتی۔ کامیابی کے لیے بہرحال چاروں شرائط پر عمل درآمد ضروری ہے۔

**آیت ۳** ﴿اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ۬ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ﴿۳﴾﴾

”سوائے اُن کے جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے اور انہوں نے ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کی اور انہوں نے باہم ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کی۔“

ان شرائط میں پہلی اور بنیادی شرط یہ ہے کہ انسان ایمان لائے۔ اس میں ایمان باللہ، ایمان بالرسالت اور ایمان بالآخرت سمیت تمام ایمانیات شامل ہیں۔ یعنی انسان اس کائنات کے مخفی اور غیبی حقائق کو سمجھے، اُن کا شعور حاصل کرے اور اُن کی تصدیق کرے۔ ایمان لانے کے بعد دوسری شرط اس ایمان کے عملی تقاضوں کو پورا کرنے سے متعلق ہے۔ یعنی اگر انسان اللہ پر ایمان رکھتا ہے تو اس کے عمل اور کردار سے ثابت ہونا چاہیے کہ وہ اللہ کا فرمانبردار بندہ ہے اور اُس کی نافرمانی سے ڈرتا ہے۔ غرض وہ ہر اس عمل کو اپنے شب و روز کے معمول کا حصّہ بنانے پر کمربستہ ہو جائے جس کا اللہ اور اُس کے رسول ﷺ نے حکم دیا ہے اور ہر اُس فعل سے اجتناب کرنے کی فکر میں رہے جس سے اللہ اور اُس کے رسول ﷺ نے منع کیا ہے۔

تیسری شرط ”تواصی بالحق“ کی ہے۔ یعنی جس حق کو انسان نے خود قبول کیا ہے اور اپنی عملی زندگی کو اس کے مطابق ڈھالا ہے اس حق کی تبلیغ و اشاعت کے لیے وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا علمبردار بن جائے۔ اس کے بعد چوتھی اور آخری شرط ”تواصی بالصبر“ کی ہے اور یہ ”تواصی بالحق“ کا لازمی اور منطقی نتیجہ بھی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا جو بندہ ”تواصی بالحق“ کا علم اٹھائے گا اُسے شیطانی قوتوں کی مخالفت مول لے کر آزمائش و ابتلا کی مشکل گھاٹیوں سے بھی گزرنا ہو گا اور اس راستے پر چلتے ہوئے نہ صرف اُسے خود صبر و استقامت کا دامن مضبوطی سے تھامے رکھنا ہو گا بلکہ اسے اپنے ہمراہیوں اور ساتھیوں کو بھی اس کی تلقین و نصیحت کرنا ہو گی۔ اسی لیے حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو جب امر بالمعروف کی نصیحت کی تو ساتھ ہی صبر کی تلقین بھی کی تھی: ﴿یٰبُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْہَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَاصْبِرْ عَلٰی مَآ اَصَابَکَ ط﴾ (لقمٰن:۱۷) ”اے میرے بچے! نماز قائم کرو اور نیکی کا حکم دو اور بُرائی سے روکو اور جو بھی

تکلیف تمہیں پہنچے اس پر صبر کرو!‘‘

بہرحال راہِ حق کے مسافروں کو پہلے سے معلوم ہونا چاہیے کہ یہ راستہ آزمائش و ابتلا کے خارزاروں سے ہو کر گزرتا ہے: ﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ۭ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ١٥٥﴾ (البقرة) ’’اور ہم تمہیں لازماً آزمائیں گے کسی قدر خوف اور بھوک سے اور مالوں اور جانوں اور ثمرات کے نقصان سے۔ اور (اے نبی ﷺ!) بشارت دیجیے ان صبر کرنے والوں کو۔‘‘

یہ شہادت گہِ اُلفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا!

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ! اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ! آمین! ❁

# سُوْرَةُ الْهُمَزَةِ

## تمہیدی کلمات

سورۃ العصر میں نسلِ انسانی کو ایک بہت بڑے ممکنہ خسارے کی وعید سنائی گئی ہے اور ساتھ ہی اس خسارے سے بچنے کا طریقہ بھی بتایا گیا ہے۔ اب سورۃ الہمزہ میں تصویر کے دوسرے رخ کے طور پر ان لوگوں کے کردار کی جھلک دکھائی جا رہی ہے جو آخرت کے بارے میں کسی تنبیہہ یا وعید کو درخورِ اعتناء نہیں سمجھتے اور اندھا دھند اسی راستے پر بھاگے چلے جا رہے ہیں جو حقیقت میں خسارے اور بربادی کا راستہ ہے۔ دراصل جب انسان کے سامنے کوئی اعلیٰ نصب العین یا آدرش (ideal) نہیں ہوتا تو اس کی شخصیت پستی کی طرف مائل ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس روش پر چلتے چلتے وہ پستی کی اس حد تک پہنچ جاتا ہے جہاں اُس کے اخلاق و کردار میں خیر اور بھلائی کی کوئی رمق بھی باقی نہیں رہتی۔ ایسا انسان معاشرے میں رہتے ہوئے کسی کی غیبت کرتا ہے تو کسی پر طعنہ زنی کرتا ہے‘ کسی کی عزت پر حملہ کرتا ہے تو کسی کا مال ہڑپ کرتا ہے۔ حتیٰ کہ اگر کسی وقت وہ کوئی نیک کام بھی کرتا دکھائی دیتا ہے تو اس کے پیچھے بھی اس کا کوئی ذاتی مفاد پوشیدہ ہوتا ہے۔



غرض اُس کی ہر حرکت اُس کی پست سوچ کی مظہر اور اس کا ہر فعل اس کے گھٹیا کردار کا عکاس ہوتا ہے۔ پھر جب کسی معاشرے کے انسانوں کی غالب اکثریت پستی اور گھٹیا پن کا یہ رنگ اپنا لیتی ہے تو وہ معاشرہ مجموعی طور پر ہر قسم کے خیر سے محروم ہو کر گندگی اور غلاظت کے متعفن ڈھیر کا روپ دھار لیتا ہے۔

ایسے معاشرے کو دیکھ کر ایک حسّاس انسان بجا طور پر مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب جاتا ہے۔ دوسری طرف اس معاشرے کے فلسفی اور حکماء انسان کے بارے میں ایسے فتوے جاری کرنے میں خود کو حق بجانب سمجھنے لگتے ہیں کہ انسان تخلیقی اعتبار سے محض حیوانی داعیات و شہوات کا پتلا اور گندگی کی ایک پوٹ ہے اور یہ کہ اس میں خیر اور بھلائی کا کوئی عنصر سرے سے موجود ہی نہیں۔ ایسے ہی منفی نظریات و خیالات کے جواب کے طور پر سورۃ التّین میں نسلِ انسانی کی چار عظیم شخصیات (حضرت نوح‘ حضرت موسیٰ‘ حضرت عیسیٰ علیہم السلام اور حضرت محمد ﷺ) کے اخلاق و کردار کو بطور نمونہ پیش کر کے ثابت کیا گیا ہے کہ انسان بنیادی طور پر احسنِ تقویم کی سطح پر پیدا ہوا ہے۔ البتہ جب یہ اپنے فطری شرف سے غافل ہو جاتا ہے اور اپنی اصل عظمت کو فراموش کر دیتا ہے تب یہ پستی میں گرتے گرتے اَسفلِ سافلین کے زمرے میں شمار ہو جاتا ہے۔ بہرحال اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان جب شرفِ انسانیت کی خلعتِ فاخرہ کو اُتار پھینکتا ہے اور اپنے حیوانی داعیات کی تسکین و تشفّی کو ہی اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیتا ہے تو پھر یہ خنزیر سے بڑھ کر شہوت پرست‘ اونٹ سے بڑھ کر کینہ پرور اور بھیڑیے سے بڑھ کر سفاک بن جاتا ہے۔ یعنی یہ اشرف المخلوقات جب حیوان بنتا ہے تو بے حیائی‘ خود غرضی اور خون خواری کی دوڑ میں تمام حیوانوں کو پیچھے چھوڑ دیتا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ ۙ ١ الَّذِيْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ۙ ٢ يَحْسَبُ
اَنَّ مَالَهٗٓ اَخْلَدَهٗ ۚ ٣ كَلَّا لَيُنْۢبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ۡ ٤ وَمَآ اَدْرٰىكَ
مَا الْحُطَمَةُ ۭ ٥ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۙ ٦ الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ ۭ ٧
اِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ ۙ ٨ فِيْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ٩

آیت ۱ ﴿وَيۡلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِۨ ۝١﴾ ''بڑی خرابی ہے ہر اُس شخص کے لیے جو لوگوں کے عیب چنتا رہتا ہے اور طعنے دیتا رہتا ہے۔''

هُمَزَة اور لُمَزَة دونوں الفاظ معنی کے اعتبار سے باہم بہت قریب ہیں۔ بعض اہل لغت کے نزدیک روبرو طعنہ زنی کرنے والے کو هُمَزَة اور پس پشت عیب جوئی کرنے والے کو لُمَزَة کہتے ہیں' جبکہ بعض اہل لغت نے ان کا معنی برعکس بیان کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ ہر چغلی کھانے والے' دوستوں میں جدائی اور تفرقہ ڈالنے والے' بے قصور اور بے عیب انسانوں میں نقص نکالنے والے کو هُمَزَة اور لُمَزَة کہتے ہیں۔

آیت ۲ ﴿الَّذِيۡ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ۝٢﴾ ''جو مال جمع کرتا رہا اور اس کو گنتا رہا۔''

جس نے اپنی زندگی اور زندگی کی ساری جِدّوجہد مال کمانے اور اس کا حساب رکھنے میں برباد کر دی۔ وہ یہی سوچ سوچ کر خوش ہوتا رہا کہ اس ماہ میرے اکاؤنٹس میں اتنے فیصد اضافہ ہو گیا ہے اور پچھلے سال کے مقابلے میں اس سال میرے اثاثہ جات اس قدر بڑھ گئے ہیں۔

آیت ۳ ﴿يَحۡسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخۡلَدَهٗ ۝٣﴾ ''وہ سمجھتا ہے کہ اُس کا مال اسے ہمیشہ باقی رکھے گا۔''

گویا اُس کے مال نے اسے زندۂ جاوید کر دیا ہے۔ ایک دولت مند آدمی اپنی دولت کے ذریعے دنیا میں ایسے آثار ونقوش چھوڑ کر جانا چاہتا ہے جن کی وجہ سے اس کا نام دنیا میں ہمیشہ رہے۔ انسان کی اسی خواہش نے اسے اہرامِ مصر جیسے عجائبات کی تخلیق پر مجبور کیا۔ مشہور انگریزی نظم "The Pyramids" کے ان الفاظ میں انسان کی اسی نفسیات کی عکاسی کی گئی ہے:

*Calm and self possessed,*
*Still and resolute,*
*Pyramids echo into eternity,*
*They define the cry of man's will*
*To survive and conquer the storms of time.*

آیت ۴ ﴿كَلَّا لَيُنۡۢبَذَنَّ فِي الۡحُطَمَةِ ۝٤﴾ ''ہرگز نہیں' وہ تو یقیناً جھونک دیا جائے گا حُطمہ میں۔''

حُطَمَة : حَطَمَ سے ہے' یعنی توڑ ڈالنے والی' پیس ڈالنے والی' چُور چُور اور ریزہ ریزہ



کر دینے والی۔ یہ دوزخ کے ایک خاص طبقے کا نام ہے جس کی آگ اتنی تیز ہو گی کہ اس میں جو شے بھی ڈالی جائے گی اس کو آنِ واحد میں پیس کر رکھ دے گی۔

آیت ۵ ﴿وَمَاۤ اَدۡرٰىكَ مَا الۡحُطَمَةُ ۝٥﴾ ''اور کیا تم جانتے ہو وہ حُطمہ کیا ہے؟''

آیت ۶ ﴿نَارُ اللّٰهِ الۡمُوۡقَدَةُ ۝٦﴾ ''وہ آگ ہے اللہ کی بھڑکائی ہوئی۔''

آیت ۷ ﴿الَّتِيۡ تَطَّلِعُ عَلَى الۡاَفۡـِٕدَةِ ۝٧﴾ ''جو دلوں کے اوپر جا چڑھے گی۔''

یعنی اس آگ کی حدت اور تپش انسان کی جلد سے زیادہ اس کے دل پر اثر انداز ہو گی۔ بہرحال آج جب انسان خود Infra red Rays اور Ultra violet Rays سمیت آگ اور حرارت کی رنگارنگ اقسام ایجاد کر چکا ہے اس کے لیے ''حُطَمَه'' کی مذکورہ خصوصیت کو سمجھنا بہت آسان ہو گیا ہے۔ ایک صاحب نے خیال پیش کیا ہے کہ حُطَمَة ایٹمی حرارت کی کوئی شکل ہو گی۔ ان کا کہنا ہے کہ ایٹم سے جو حرارت پھیلتی ہے وہ براہِ راست آگ نہیں ہوتی لیکن انسان کے وجود کو چیرتی چلی جاتی ہے۔

آیت ۸ ﴿اِنَّهَا عَلَيۡهِمۡ مُّؤۡصَدَةٌ ۝٨﴾ ''بے شک وہ (آگ) ان پر بند کر دی جائے گی۔''

تاکہ اس کی تمام تر حرارت ان پر اثر انداز ہو اور انہیں زیادہ سے زیادہ تکلیف پہنچے۔

آیت ۹ ﴿فِيۡ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ۝٩﴾ ''بڑے اونچے اونچے لمبے ستونوں میں۔''

اَللّٰهُمَّ اَجِرۡنَا مِنَ النَّارِ! يَا مُجِيۡرُ يَا مُجِيۡرُ يَا مُجِيۡرُ!! ❁

# سُوۡرَةُ الۡفِيۡلِ

## تمہیدی کلمات

سورۃ الفیل اور اس کے بعد کی سورتوں میں سے اکثر کا تعلق حضور ﷺ کی سیرت یا آپ ﷺ کے زمانے کے عرب معاشرے کے ماحول اور حالات سے ہے۔ جیسے سورۃ الفیل میں جس واقعہ کا ذکر ہے یہ واقعہ اُسی سال پیش آیا جس سال حضور ﷺ کی ولادت باسعادت ہوئی۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ آپؐ کی ولادت عین اس واقعہ کے دن ہوئی تھی۔ البتہ کچھ ایسی

روایات بھی ملتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ اس واقعہ کے پچاس دن بعد پیدا ہوئے تھے۔

اس واقعہ کا پس منظر یوں ہے کہ یمن کے عیسائی بادشاہ اَبرہہ نے خانہ کعبہ کے مقابلے میں ایک عالیشان کلیسا اس غرض سے تعمیر کرایا کہ عرب کے لوگ خانہ کعبہ کا حج کرنے کے بجائے اس کلیسا میں حاضری دیا کریں۔لیکن اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود وہ لوگوں کی توجہ اس طرف مبذول کرانے میں ناکام رہا۔اسی دوران کسی عرب نے شرارتاً اس کلیسا میں رفع حاجت کر کے غلاظت بکھیر دی۔ابرہہ تو پہلے ہی حسد کی آگ میں جل رہا تھا' اس واقعہ کو بہانہ بنا کر اُس نے کعبہ کو مسمار کرنے کے ارادے سے مکّہ مکرمہ پر باقاعدہ چڑھائی کر دی۔مکّہ پر حملہ آور ہونے والے ابرہہ کے لشکر کی تعداد ساٹھ ہزار تھی اور ان کے ساتھ بہت سے ہاتھی بھی تھے۔اسی لیے عربوں نے اس لشکر کو ''اصحاب الفیل'' کا نام دیا اور جس سال یہ لشکر حملہ آور ہوا تھا وہ سال ان کے ہاں ''عام الفیل'' کے نام سے مشہور ہوا۔بہر حال اللہ تعالیٰ نے معجزانہ طور پر اپنے گھر کی حفاظت فرمائی اور ابرہہ کے لشکر کو چھوٹے چھوٹے پرندوں کے ذریعے نیست و نابود کر دیا۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

اَلَمۡ تَرَ کَیۡفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِاَصۡحٰبِ الۡفِیۡلِ ؕ﴿۱﴾ اَلَمۡ یَجۡعَلۡ کَیۡدَہُمۡ
فِیۡ تَضۡلِیۡلٍ ۙ﴿۲﴾ وَّ اَرۡسَلَ عَلَیۡہِمۡ طَیۡرًا اَبَابِیۡلَ ۙ﴿۳﴾ تَرۡمِیۡہِمۡ
بِحِجَارَۃٍ مِّنۡ سِجِّیۡلٍ ۪ۙ﴿۴﴾ فَجَعَلَہُمۡ کَعَصۡفٍ مَّاۡکُوۡلٍ ٪﴿۵﴾

**آیت ۱** ﴿اَلَمۡ تَرَ کَیۡفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِاَصۡحٰبِ الۡفِیۡلِ ①﴾ ''کیا تم نے دیکھا نہیں کیا حشر کیا تمہارے رب نے اُن ہاتھی والوں کا؟''

**آیت ۲** ﴿اَلَمۡ یَجۡعَلۡ کَیۡدَہُمۡ فِیۡ تَضۡلِیۡلٍ ②﴾ ''کیا اُس نے اُن کی تمام تدبیروں کو بے کار اور غیر مؤثر نہیں کر دیا؟''

اَبرہہ کی اس لشکر کشی کا مقصد انہدامِ کعبہ کے علاوہ عرب میں عیسائیت پھیلانا اور اُس تجارت پر قبضہ کرنا بھی تھا جو بلادِ مشرق اور رومی مقبوضات کے درمیان عربوں کے ذریعے ہوتی تھی۔

**آیت ۳** ﴿وَاَرۡسَلَ عَلَیۡہِمۡ طَیۡرًا اَبَابِیۡلَ ③﴾ ''اور اُن پر بھیج دیے جھنڈ کے جھنڈ اُڑتے ہوئے پرندوں کے۔''



**آیت ۴** ﴿تَرۡمِیۡہِمۡ بِحِجَارَۃٍ مِّنۡ سِجِّیۡلٍ ④﴾ ''جو اُن پر مارتے تھے کنکر کی پتھریاں۔''

رَمٰی یَرْمِی رَمْیًا کا معنی ہے پھینکنا' مارنا۔حج کے دوران شیطان کو کنکریاں مارنے کے عمل کو بھی ''رمیٔ جمرات'' کہا جاتا ہے۔لفظ سِجِّیۡل دراصل فارسی ترکیب ''سنگ گِل'' سے معرب ہے (فارسی کی ''گ'' عربی میں آ کر ''ج'' سے بدل گئی ہے)۔فارسی میں سنگ بمعنی پتھر اور گِل بمعنی مٹی استعمال ہوتا ہے۔چنانچہ سنگ گِل کے لغوی معنی ہیں مٹی کا پتھر۔اس سے مراد وہ کنکریاں ہیں جو ریتلی زمین پر ہلکی بارش برسنے اور بعد میں مسلسل تیز دھوپ چمکنے کی وجہ سے وجود میں آتی ہیں۔یعنی بارش کے ایک ایک قطرے کے ساتھ جو ریت ملی مٹی گیلی ہو جاتی ہے وہ بعد میں مسلسل تیز دھوپ کی حرارت سے پک کر سخت کنکری بن جاتی ہے۔

ابرہہ کے لشکر جرار کو تباہ کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کو کسی غیر معمولی طاقت کے استعمال کی ضرورت نہ پڑی' بلکہ اُس نے چھوٹے چھوٹے پرندوں کے جھنڈ بھیج دیے جو ساحلِ سمندر کی طرف سے اُمڈ پڑے اور چند لمحوں کی سنگ باری سے اس لشکر کا بھرکس نکال دیا۔ان میں سے ہر پرندہ تین چھوٹی چھوٹی کنکریاں اٹھائے ہوئے تھا' ایک اپنی چونچ میں اور دو اپنے پنجوں میں۔

**آیت ۵** ﴿فَجَعَلَہُمۡ کَعَصۡفٍ مَّاۡکُوۡلٍ ⑤﴾ ''پھر اُس نے کر دیا ان کو کھائے ہوئے بُھس کی طرح۔''

یعنی اس پورے لشکر کی حالت اُس چارے یا بُھس کی طرح ہو گئی جسے جانوروں نے کھا کر چھوڑ دیا ہو۔ ۞

# سُوۡرَۃُ قُرَیۡشٍ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

لِاِیۡلٰفِ قُرَیۡشٍ ۙ﴿۱﴾ اٖلٰفِہِمۡ رِحۡلَۃَ الشِّتَآءِ وَ الصَّیۡفِ ۚ﴿۲﴾ فَلۡیَعۡبُدُوۡا
رَبَّ ہٰذَا الۡبَیۡتِ ۙ﴿۳﴾ الَّذِیۡۤ اَطۡعَمَہُمۡ مِّنۡ جُوۡعٍ ۬ۙ وَّ اٰمَنَہُمۡ مِّنۡ خَوۡفٍ ٪﴿۴﴾

**آیت ۱** ﴿لِاِیۡلٰفِ قُرَیۡشٍ ①﴾ ''قریش کے مانوس رکھنے کی وجہ سے۔''

**آیت ۲:** ﴿اٖلٰفِهِمۡ رِحۡلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيۡفِ ۚ۲﴾ ’’(یعنی) سردیوں اور گرمیوں کے سفر سے ان کو مانوس رکھنے کی وجہ سے۔‘‘

یعنی اللہ تعالیٰ نے قریش کے دلوں میں سردی اور گرمی کے تجارتی سفروں کی اُلفت ومحبّت پیدا کردی۔

اِیلاف: اَلِفَ یَأْلَفُ اَلْفًا سے باب افعال کا مصدر ہے‘ یعنی مانوس کرنا اور خوگر بنانا۔ اردو میں اُلفت اور مالوف کے الفاظ بھی اسی سے ماخوذ ہیں۔

سورۃ قریش کی پہلی دو آیات میں قریش کی اس اجارہ داری کی طرف اشارہ ہے جو حضورﷺ کی پیدائش سے قبل زمانے میں انہیں مشرق اور مغرب کی تجارت پر حاصل تھی۔ اس زمانے میں مشرقِ بعید کے ممالک (ہندوستان‘ جاوا‘ ملایا‘ سماٹرا‘ چین وغیرہ) سے بحرِ ہند کے راستے جو سامانِ تجارت آتا تھا وہ یمن کے ساحل پر اترتا تھا۔ دوسری طرف یورپ سے آنے والے جہاز شام اور فلسطین کے ساحل پر لنگر انداز ہوتے تھے۔ اس کے بعد یمن سے سامانِ تجارت کو شام پہنچانے اور ادھر کا سامان یمن پہنچانے کے لیے خشکی کا راستہ استعمال ہوتا تھا۔ چنانچہ یمن اور شام کے درمیان اس راستے کی حیثیت اُس زمانے میں گویا بین الاقوامی تجارتی شاہراہ کی سی تھی۔ ظاہر ہے یورپ کو انڈیا سے ملانے والا سمندری راستہ (around the cape of good hope) تو واسکوڈے گاما نے صدیوں بعد ۱۴۹۸ء میں دریافت کیا تھا‘ جبکہ بحیرۂ احمر کو بحرِ روم سے ملانے والی نہر سویز ۱۸۶۹ء میں بنی تھی۔

حضورﷺ کی ولادت سے تقریباً ڈیڑھ دو سو سال پہلے تک اس تجارتی شاہراہ پر قومِ سبا کی اجارہ داری تھی۔ لیکن جب ’’سدِّ مآرب‘‘ ٹوٹنے کی وجہ سے اس علاقے میں سیلاب آیا اور اس سیلاب کی وجہ سے اس قوم کا شیرازہ بکھر گیا تو یہ شاہراہ کُلّی طور پر قریشِ مکّہ کے قبضے میں چلی گئی۔ قریشِ مکّہ چونکہ کعبہ کے متولی تھے اس لیے پورے عرب میں انہیں عزّت وعقیدت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اس زمانے میں جہاں کوئی بھی تجارتی قافلہ لٹیروں اور ڈاکوؤں کے ہاتھوں محفوظ نہیں تھا وہاں قریش کے قافلوں کو پورے عرب میں کوئی میلی نظر سے بھی نہیں دیکھتا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ عرب کے تمام قبائل نے اپنے اپنے بُت خانہ کعبہ میں نصب کر رکھے تھے۔ گویا ہر قبیلے کا ’’خدا‘‘ قریش کی مہربانی سے ہی خانہ کعبہ میں قیام پذیر تھا‘ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ



قریش کے پاس یرغمال تھا۔ اس لیے عرب کا کوئی قبیلہ بھی ان کے قافلوں پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہیں کرسکتا تھا۔ چنانچہ قریش کے قافلے سارا سال بلاخوف وخطر یمن سے شام اور شام سے یمن کے راستے پر رواں دواں رہتے تھے۔ گرمیوں کے موسم میں وہ لوگ شام وفلسطین کے سرد علاقوں جبکہ سردیوں میں یمن کے گرم علاقے کا سفر اختیار کرتے تھے۔ آیت زیرِ مطالعہ میں ان کے اسی تجارتی سفر کا ذکر ہے۔ ظاہر ہے بین الاقوامی تجارتی شاہراہ پر مکمل اجارہ داری‘ تجارتی قافلوں کے ہمہ وقت تحفظ کی یقینی ضمانت اور موسموں کی موافقت اور مطابقت سے سرد وگرم علاقوں کے سفر کی سہولت‘ یہ ان لوگوں کے لیے ایسی نعمتیں تھیں جس پر وہ اللہ تعالیٰ کا جتنا بھی شکر ادا کرتے کم تھا۔ اس لیے ان نعمتوں کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا:

**آیت ۳:** ﴿فَلۡيَعۡبُدُوۡا رَبَّ هٰذَا الۡبَيۡتِ ۙ۳﴾ ’’پس انہیں بندگی کرنی چاہیے اس گھر کے ربّ کی۔‘‘

ظاہر ہے ان کے جدِّ امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کا یہ گھر (ع ’’دنیا کے بُت کدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا‘‘) توحید کے مرکز کی حیثیت سے تعمیر کیا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنی اولاد کو اس گھر کے پہلو میں بساتے وقت توحید کے اعتبار سے ان کی ذِمّہ داری کا ذکر ان الفاظ میں کیا تھا: ﴿لِيُقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ﴾ تاکہ وہ اللہ کی بندگی کے طور پر نماز قائم کریں۔ چنانچہ چاہیے تو یہ تھا کہ جس کعبہ کی تولیت کی وجہ سے انہیں خوشحالی اور عزّت ملی تھی وہ اس گھر کے مالک کو پہچانتے اور اس کا حق ادا کرتے۔ لیکن اس کے برعکس انہوں نے اللہ کے اس گھر میں ۳۶۰ بُت نصب کر کے اسے دنیا کے سب سے بڑے بُت کدے میں تبدیل کردیا اور اس کے اصل مالک کو بالکل ہی فراموش کردیا۔

**آیت ۴:** ﴿الَّذِيۡۤ اَطۡعَمَهُمۡ مِّنۡ جُوۡعٍ ۙ﴾ ’’جس نے انہیں بھوک میں کھانے کو دیا‘‘

انہیں رزق عطا فرما کر فاقہ کشی سے محفوظ رکھا۔ جب عرب کے عام لوگ غربت اور تنگ دستی کا شکار تھے اُس وقت بھی اللہ تعالیٰ نے قریشِ مکّہ کو کامیاب تجارت اور کعبہ کی تولیت کی وجہ سے معاشی خوشحالی سے نواز رکھا تھا۔

﴿وَّاٰمَنَهُمۡ مِّنۡ خَوۡفٍ ۴﴾ ’’اور انہیں خوف سے امن عطا کیا۔‘‘

ان کے قافلے سارا سال یمن اور فلسطین کے درمیان بلاخوف وخطر محوِ سفر رہتے تھے۔ خداداد تحفظ کی یہ ضمانت انہیں اس سرزمین میں میسّر تھی جہاں ہر طرف جنگل کے قانون کا راج تھا۔

# سُوْرَۃُ الْمَاعُوْنِ

## تمہیدی کلمات

سورۃ الماعون میں اس معاشرے کے اخلاقی انحطاط کی جھلک دکھائی گئی ہے جس میں حضورﷺ کی بعثت ہوئی۔ وہ لوگ بظاہر تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پیروکار تھے‘ لیکن عملی طور پر صورتحال یہ تھی کہ ان کے عقائد و نظریات مسخ ہو چکے تھے اور معاشرتی و اخلاقی اقدار بھی ان کے ہاں اب محض روایتوں اور رسموں کی حد تک زندہ رہ گئی تھیں۔ بدقسمتی سے آج اُمّتِ مُسلمہ بھی ایسے ہی نظریاتی و اخلاقی انحطاط کا نقشہ پیش کر رہی ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

اَرَءَیۡتَ الَّذِیۡ یُکَذِّبُ بِالدِّیۡنِ ؕ﴿۱﴾ فَذٰلِکَ الَّذِیۡ یَدُعُّ الۡیَتِیۡمَ ۙ﴿۲﴾
وَ لَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الۡمِسۡکِیۡنِ ؕ﴿۳﴾ فَوَیۡلٌ لِّلۡمُصَلِّیۡنَ ۙ﴿۴﴾ الَّذِیۡنَ
ہُمۡ عَنۡ صَلَاتِہِمۡ سَاہُوۡنَ ۙ﴿۵﴾ الَّذِیۡنَ ہُمۡ یُرَآءُوۡنَ ۙ﴿۶﴾ وَ یَمۡنَعُوۡنَ
الۡمَاعُوۡنَ ٪﴿۷﴾

**آیت ۱** ﴿اَرَءَیۡتَ الَّذِیۡ یُکَذِّبُ بِالدِّیۡنِ ۱﴾ ”کیا تم نے دیکھا اُس شخص کو جو جزا و سزا کو جھٹلاتا ہے؟“

جو نہ تو بعث بعد الموت کا قائل ہے اور نہ ہی آخرت کی جزا و سزا کو مانتا ہے۔ ایسے لوگ سمجھتے ہیں کہ اس زندگی کے سوا ان کی کوئی اور زندگی نہیں ہے: ﴿وَقَالُوۡا مَا ہِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنۡیَا نَمُوۡتُ وَ نَحۡیَا وَ مَا یُہۡلِکُنَاۤ اِلَّا الدَّہۡرُ ۚ﴾ (الجاثیۃ:۲۴) ”وہ کہتے ہیں کہ نہیں ہے (کوئی اور زندگی) سوائے ہماری دنیا کی زندگی کے‘ ہم خود ہی مرتے ہیں اور خود ہی جیتے ہیں اور ہمیں نہیں ہلاک کرتا مگر زمانہ۔“

آخرت کے احتساب کا انکار کر کے انسان دراصل جائز و ناجائز اور حلال و حرام کی



پابندیوں سے آزاد ہو جاتا ہے اور اس کا کردار ع ”بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست“ کے فلسفے کا چلتا پھرتا اشتہار بن کر رہ جاتا ہے۔

**آیت ۲** ﴿فَذٰلِکَ الَّذِیۡ یَدُعُّ الۡیَتِیۡمَ ۲﴾ ”یہ وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے۔“

ظاہر ہے جو انسان اچھے بُرے اعمال کی جزا و سزا کو نہیں مانتا وہ معاشرے کے ایسے افراد کے لیے اپنا مال بھلا کیوں ضائع کرے گا جن سے اسے کسی فائدے کی توقع نہیں؟

**آیت ۳** ﴿وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الۡمِسۡکِیۡنِ ۳﴾ ”اور نہ وہ مسکین کو کھانا کھلانے کی تلقین کرتا ہے۔“

اس میں انسان کی اس اخلاقی کمزوری کی طرف بھی اشارہ ہے کہ جس نیک کام پر وہ خود کاربند نہیں ہے اس کے بارے میں دوسروں کو کس منہ سے نصیحت کرے۔

**آیت ۴، ۵** ﴿فَوَیۡلٌ لِّلۡمُصَلِّیۡنَ ۴ الَّذِیۡنَ ہُمۡ عَنۡ صَلَاتِہِمۡ سَاہُوۡنَ ۵﴾ ”تو بربادی ہے اُن نماز پڑھنے والوں کے لیے‘ جو اپنی نمازوں سے غافل ہیں۔“

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورﷺ کی بعثت کے زمانے تک مشرکین عرب کے ہاں نماز کا تصور موجود تھا لیکن اس کی عملی شکل بالکل مسخ ہو چکی تھی۔ جیسا کہ سورۃ الانفال کی اس آیت سے بھی ظاہر ہوتا ہے: ﴿وَمَا کَانَ صَلَاتُہُمۡ عِنۡدَ الۡبَیۡتِ اِلَّا مُکَآءً وَّ تَصۡدِیَۃً ؕ﴾ (آیت ۳۵) ”اور نہیں ہے ان کی نماز بیت اللہ کے پاس سوائے سیٹیاں بجانا اور تالیاں پیٹنا“۔ ظاہر ہے جو لوگ برہنہ ہو کر خانہ کعبہ کا طواف کرتے تھے اور اس طواف کو سب سے اعلیٰ طواف سمجھتے تھے‘ ان کے لیے تو نماز میں سیٹیاں بجانا اور تالیاں پیٹنا بھی ایک مقدس عمل اور حصولِ ثواب کا بہت بڑا ذریعہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ہم مسلمانوں کے ہاں نماز کی ظاہری شکل آج تک اپنی اصلی حالت میں جوں کی توں قائم ہے۔ حضورﷺ نے صحابہ کرام ؓ کو نماز پڑھنے کا طریقہ سکھایا اور پھر حکم دیا: ((صَلُّوۡا کَمَا رَأَیۡتُمُوۡنِیۡ اُصَلِّیۡ))[1] کہ تم لوگ نماز اسی طرح پڑھو جس طرح مجھے پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو۔ حضورﷺ کی نماز کا وہ طریقہ اور عملی نمونہ جو صحابہؓ کی وساطت سے ہم تک پہنچا ہے‘ آج ہم اس پر تو کاربند ہیں لیکن بدقسمتی سے نماز کی اصل روح سے ہم بالکل غافل ہو چکے ہیں۔ نماز کی اصل روح تو نمازی کا خضوع و خشوع اور یہ احساس ہے کہ وہ کس کے

۱۔ صحیح البخاری‘ کتاب الاذان‘ باب الاذان للمسافر...‘ ح: ۶۳۱۔

سامنے کھڑا ہے اور کس کے حضور کھڑے ہو کر ﴿اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ﴾ جیسا عہد و پیمان باندھ رہا ہے۔ بہرحال آج ہماری نمازیں اس روح سے خالی ہو کر محض ایک ’’رسم‘‘ کی ادائیگی کی حیثیت اختیار کر چکی ہیں (اِلاماشاء اللہ)۔ اقبال نے اپنے خصوصی انداز میں مسلمانوں کی اس زبوں حالی کی تصویر انہیں بار بار دکھائی ہے: ؎

رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالیؓ نہ رہی
فلسفہ رہ گیا تلقینِ غزالیؒ نہ رہی!

اور ؎

نماز و روزہ و قربانی و حج
یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے!

**آیت ۶** ﴿الَّذِیۡنَ ہُمۡ یُرَآءُوۡنَ ۙ﴿۶﴾﴾ ’’یہ وہ لوگ ہیں جو دکھاوا کرتے ہیں۔‘‘

وہ نماز کی ادائیگی سمیت ہر نیک کام لوگوں کو دکھانے کے لیے کرتے ہیں تاکہ ان کی نیکی کا چرچا ہو۔

**آیت ۷** ﴿وَ یَمۡنَعُوۡنَ الۡمَاعُوۡنَ ٪﴿۷﴾﴾ ’’اور عام استعمال کی چیز بھی (مانگنے پر) نہیں دیتے۔‘‘

مَاعُوۡن کے معنی روزمرہ استعمال کی چیزیں ہیں‘ جو ہر پڑوسی بوقت ضرورت اپنے پڑوسی سے عاریتاً لے لیتا ہے اور اپنی ضرورت پوری کر کے واپس لوٹا دیتا ہے۔ ایسے لوگوں کے کردار کی پستی کا یہ عالم ہے کہ وہ اپنے پاس سے آگ کی چنگاری (ماچس وغیرہ) اور نمک جیسی معمولی اشیاء تک بھی کسی کو دینا پسند نہیں کرتے۔ ❀❀

# سُوۡرَۃُ الۡکَوۡثَرِ

## تمہیدی کلمات

سورۃ الکوثر اور اس سے پہلے کی تین سورتوں کے مضمون میں باہم گہرا ربط اور تعلق پایا جاتا ہے۔ اس ربط کو یوں سمجھئے کہ پہلی تین سورتوں (سورۃ الفیل‘ سورۂ قریش اور سورۃ الماعون) میں



حضورﷺ کی بعثت سے قبل کے ماحول کا تاریخی‘ اقتصادی اور اخلاقی پس منظر دکھایا گیا ہے‘ جبکہ سورۃ الکوثر میں آپﷺ کی بعثت کا ذکر ہے۔ گویا مذکورہ تینوں سورتوں کی حیثیت سورۃ الکوثر کی تمہید کی سی ہے۔ سورۃ الفیل میں اُس دور کے ایک بہت اہم تاریخی واقعہ کا ذکر ہے۔ سورۂ قریش میں قریشِ مکہ کی اقتصادیات کا حوالہ ہے کہ انہیں جو خوشحالی اور امن و امان حاصل ہے وہ صرف اور صرف بیت اللہ کی وجہ سے ہے‘ جبکہ سورۃ الماعون میں اس معاشرے کی اخلاقی پستی کی نشاندہی کی گئی ہے‘ اور اب سورۃ الکوثر میں حضور اکرمﷺ کی بعثت کا ذکر ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝

اِنَّاۤ اَعۡطَیۡنٰکَ الۡکَوۡثَرَ ؕ﴿۱﴾ فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَ انۡحَرۡ ؕ﴿۲﴾ اِنَّ شَانِئَکَ ہُوَ الۡاَبۡتَرُ ٪﴿۳﴾

**آیت ۱** ﴿اِنَّاۤ اَعۡطَیۡنٰکَ الۡکَوۡثَرَ ؕ﴿۱﴾﴾ ’’(اے نبیﷺ!) ہم نے آپ کو خیرِ کثیر عطا کیا۔‘‘

الکوثر: کثرت سے ماخوذ ہے‘ اس کا وزن فَوْعَلْ ہے جو مبالغہ کا صیغہ ہے۔ اس کا معنی ہے کسی چیز کا اتنا کثیر ہونا کہ اس کا اندازہ نہ لگایا جا سکے۔ چنانچہ اس کا ترجمہ ’’خیرِ کثیر‘‘ کیا گیا ہے۔

’’الکوثر‘‘ کے بارے میں ایک رائے یہ بھی ہے کہ اس سے حوضِ کوثر مراد ہے‘ جو میدانِ حشر میں ہوگا اور اس سے حضورﷺ اپنی اُمت کے پیاسوں کو سیراب فرمائیں گے۔ لیکن درحقیقت وہ بھی ’’خیرِ کثیر‘‘ ہی میں شامل ہے۔ ’’خیرِ کثیر‘‘ کی وضاحت سے متعلق بھی تفاسیر میں لگ بھگ پچیس تیس اقوال ملتے ہیں۔ حضورﷺ کو عطا ہونے والے خیرِ کثیر کی سب سے بڑی مثال خود قرآن مجید ہے۔ اسی طرح اس کی ایک مثال حکمت بھی ہے۔ ظاہر ہے آپﷺ کو اعلیٰ ترین درجے میں حکمت بھی عطا ہوئی تھی‘ جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿یُّؤۡتِی الۡحِکۡمَۃَ مَنۡ یَّشَآءُ ۚ وَ مَنۡ یُّؤۡتَ الۡحِکۡمَۃَ فَقَدۡ اُوۡتِیَ خَیۡرًا کَثِیۡرًا ؕ﴾ (البقرۃ:۲۶۹) ’’وہ جس کو چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے‘ اور جسے حکمت دے دی گئی اسے تو خیرِ کثیر عطا ہو گیا‘‘۔ مزید برآں جنّت کی نہرِ کوثر‘ نبوت کے فیوض و برکات‘ دینِ اسلام‘ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی کثرت‘ رفعِ ذکر اور مقامِ محمود کو ’’کوثر‘‘ کا مصداق سمجھا گیا ہے۔ چنانچہ اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اے نبی (ﷺ) ہم نے

آپ کو وہ سب کچھ عطا کر دیا اور کثرت کے ساتھ عطا کر دیا جس کی انسانیت کو ضرورت ہے اور جو نوعِ انسانی کے لیے طرّۂ امتیاز بن سکتا ہے۔

**آیت ۲** ﴿فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ۝۲﴾ ''پس آپؐ اپنے رب کے لیے نماز پڑھا کیجیے اور قربانی کیا کیجیے۔''

نحر کے لغوی معنی اونٹ ذبح کرنے کے ہیں۔ اس آیت میں جن دو احکام کا ذکر ہے ان دونوں پر عید الاضحیٰ کے دن عمل ہوتا ہے۔ یعنی عید الاضحیٰ کے دن پہلے مسلمان نماز پڑھتے ہیں اور پھر جانور قربان کرتے ہیں۔

**آیت ۳** ﴿اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ۝۳﴾ ''یقیناً آپ (ﷺ) کا دشمن ہی جڑ کٹا ہوگا۔''

شَانِئ بغض وعداوت رکھنے والے دشمن کو کہتے ہیں۔ اَبْتَر: بتر سے ہے' یعنی کسی چیز کو کاٹ دینا' منقطع کر دینا۔ اہلِ عرب دُم کٹے جانور کو اَبْتَر کہتے ہیں۔ عرفِ عام میں اس سے ایسا آدمی مراد لیا جاتا ہے جس کی نرینہ اولاد نہ ہو اور جس کی نسل آگے چلنے کا کوئی امکان نہ ہو۔ یہ لفظ مشرکینِ مکّہ نے (معاذ اللہ) حضور ﷺ کے لیے استعمال کیا تھا' جس کا جواب اس آیت میں دیا گیا ہے۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰ ؓ کے بطن سے حضور ﷺ کی یہ اولاد پیدا ہوئی: قاسم' پھر زینب' پھر عبداللہ' پھر رقیہ' پھر اُمّ کلثوم' پھر فاطمہ۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔ پہلے قاسم کا انتقال ہوا۔ پھر عبداللہ (جن کا لقب طیب و طاہر ہے) داغِ مفارقت دے گئے۔ اس پر مشرکین نے خوشیاں منائیں کہ آپؐ کے دونوں فرزند فوت ہو گئے ہیں اور باقی اولاد میں آپؐ کی بیٹیاں ہی بیٹیاں ہیں۔ لہٰذا آپؐ جو کچھ بھی ہیں بس اپنی زندگی تک ہی ہیں' آپؐ کے بعد نہ تو آپؐ کی نسل آگے چلے گی اور نہ ہی کوئی آپؐ کا نام لیوا ہوگا۔ اس پس منظر میں یہاں ان لوگوں کو سنانے کے لیے فرمایا جا رہا ہے کہ اے نبی ﷺ! آپ کا نام اور ذکر تو ہم بلند کریں گے' جس کی وجہ سے آپ کے نام لیوا تو اربوں کی تعداد میں ہوں گے۔ البتہ آپ کے یہ دشمن واقعی اَبْتَر ہوں گے جن کا کوئی نام لیوا نہیں ہوگا۔

❁❁❁

# موت: ایک اٹل حقیقت!

## تنظیم اسلامی کے سالانہ اجتماع ۲۰۲۴ء کے موقع پر

## نائب امیر جناب اعجاز لطیف کا خطابِ جمعہ

آج کی جمعہ کی تذکیر موت کے حوالے سے ہے۔ موت ایک ایسی اٹل حقیقت ہے جس سے کوئی کافر سے کافر اور دہریے سے دہریہ شخص بھی انکار نہیں کر سکتا۔ سورۃ الملک میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ﴾ (آیت ۲)

’’اس نے موت اور حیات کا یہ سلسلہ اس لیے تخلیق فرمایا تا کہ تم سب کو (جانچے‘ پرکھے) آزمائے کہ تم میں عمل کے اعتبار سے کون اچھا ہے۔‘‘

غور فرمائیے کہ یہاں موت کا ذکر زندگی سے پہلے کیا گیا ہے۔ البتہ عمومی رویہ یہی ہے کہ کوئی بھی مرنا نہیں چاہتا۔ پندرہویں صدی عیسوی میں فرانس کا ایک بادشاہ لوئی یازدہم (Louis XI) ہوا ہے۔ اس نے طویل عرصہ بادشاہ کی حیثیت سے زندگی گزاری۔ وہ مرنا نہیں چاہتا تھا‘ چنانچہ آخری عمر میں ایک بند قلعے میں رہنے لگا تا کہ ملک الموت اس تک نہ پہنچ سکے۔ وہاں بہت کم لوگوں کو داخلے کی اجازت تھی۔ قلعے کے چاروں طرف خندق کھود دی گئی تھی تا کہ کوئی اس کے قریب نہ پہنچ سکے۔ قلعے کی دیواروں پر ہر وقت تیرانداز بیٹھے رہتے تھے۔ ان کے علاوہ چالیس گھڑسوار دن رات اس کے چاروں طرف گشت کرتے رہتے تھے۔ بادشاہ کا حکم تھا کہ جو بھی بلا اجازت قلعہ کے اندر آنے کی کوشش کرے‘ اس کو پکڑ کر اسی وقت قتل کر دیا جائے۔ قلعہ کے اندر بادشاہ کے لیے عیش وعشرت کا ہر سامان مہیا کیا گیا تھا تا کہ اسے کبھی ڈپریشن نہ ہو۔ اس کو زندہ رہنے کا اتنا شوق تھا کہ اس نے حکم دے رکھا تھا کہ اس کے سامنے موت کا لفظ ہرگز نہ بولا جائے۔ لیکن موت سے کس کو مفر ہے! یہ وہ حقیقت ہے جو قرآن حکیم بیان کرتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:



﴿قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِیْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِیْكُمْ﴾ (الجمعة:۱۱)

’’(اے نبی ﷺ!) آپ کہہ دیجیے کہ وہ موت جس سے تم بھاگتے ہو وہ تم سے ملاقات کر کے رہے گی…‘‘

موت کے لفظ سے جو فرار اختیار کیا جاتا ہے‘ اس کی یہ ایک زندہ مثال تھی۔ ایک ماہر ڈاکٹر ہر وقت اس کی خدمت میں رہتا تھا‘ جسے اس زمانے کے دس ہزار سنہری سکے دیے جاتے تھے۔ تاہم ان میں سے کوئی چیز بھی بادشاہ کو بڑھاپے اور کمزوری سے نہ بچا سکی۔ ۶۰ سال کی عمر میں وہ اتنا کمزور ہو چکا تھا کہ مشکل سے کھانے کی کوئی چیز اٹھا کر اپنے منہ میں ڈال سکتا تھا۔ اس کے باوجود اس کے جینے کی خواہش وہم کی حد تک پہنچ چکی تھی۔ اس کو کسی نے بتایا کہ کچھوے ۵۰۰ سال تک زندہ رہتے ہیں تو اس نے بحری جہاز بھیج کر جرمنی اور اٹلی کے سمندروں سے کچھوے منگوائے‘ جو اس کے قریب ایک بڑے حوض میں رکھے گئے تاکہ اس کی زندگی کو بھی کچھ دوام حاصل ہو سکے۔ تاہم یہ چیزیں اسے بچا نہ سکیں۔ آخرکار اسے فالج کا حملہ ہوا اور اگست ۱۴۸۳ء میں موت نے اس پر قابو پا لیا۔ مرنے سے پہلے اس کی زبان سے جو آخری الفاظ نکلے وہ یہ تھے کہ: ’’میں اتنا بیمار تو نہیں ہوں جتنا آپ لوگ خیال کرتے ہیں۔‘‘ تاہم اس کی تمام کوششیں بیکار ہوئیں اور آخر بادشاہ کو معلوم ہو گیا کہ موت جیسی اٹل حقیقت سے فرار ممکن نہیں۔

موت سے فرار اختیار کرنے کی مثالیں آج بھی ہمیں نظر آتی ہیں۔ کسی کی بھی میت ہو جائے تو وہاں پر بجائے اپنی موت کو یاد کرنے کے یا آخرت کے تذکرے کے باتیں پلاٹوں‘ دکانوں‘ سٹاک ایکسچینج‘ سیاست کی ہو رہی ہوتی ہیں۔ میت پاس پڑی ہوئی ہے لیکن کسی کو یہ یاد نہیں کہ میرا بھی یہ انجام ہونا ہے بلکہ وہ دنیوی گفتگو میں لگے ہوئے ہیں۔ فرمایا:

﴿ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰی عٰلِمِ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ فَیُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۸﴾

’’پھر تم لوٹائے جاؤ گے اس ہستی کی طرف جو پوشیدہ اور ظاہر سب کا جاننے والا ہے‘ پھر وہ تمہیں جتلا دے گا جو کچھ تم کرتے رہے تھے۔‘‘

یہ زندگی جوں جوں گزرتی جاتی ہے‘ امیدیں جوان ہوتی جاتی ہیں اور انسان اپنی خواہشات کے حصول کے لیے دن رات ایک کر دیتا ہے۔ ایسے میں زندگی بڑی حسین وجمیل لگنے لگتی ہے۔ مسلسل اٹھارہ‘ بیس گھنٹے کام کرنے میں لگا رہتا ہے‘ حتیٰ کہ بالوں میں سفیدی آنے لگتی

ہے۔ وقت کا دریا کامیابیوں‘ ناکامیوں‘ خواہشات‘ خوشیوں اور غمیوں کے نشیب و فراز کے ساتھ مسلسل بہتا رہتا ہے۔ انسان آہستہ آہستہ تھکن محسوس کرنے لگتا ہے ۔ بڑھاپا موت کے دروازے پر دستک دینے لگتا ہے لیکن غافل انسان پھر بھی ویسے ہی رواں دواں رہتا ہے اور یہی سمجھتا ہے کہ ابھی بڑا وقت پڑا ہے۔ طویل خواہشات‘ طویل امیدوں اور طویل منصوبوں کے حصول کا سفر جاری رہتا ہے۔ ڈالر‘ ریال‘ یورو‘ روپے‘ پلاٹ‘ فلائٹ‘ فیکٹریوں‘ کوٹھیوں‘ گاڑیوں کے چکر سے انسان نکل نہیں پاتا۔ بلند تر معیارِ ہستی کے حصول کے لیے دن رات ایک کر دیتا ہے۔ دائیں بائیں‘ آگے پیچھے عزیز و اقارب کی اموات ہوتی رہتی ہیں لیکن انسان رسم تعزیت ادا کر کے پھر اپنی انہی دلچسپیوں کے اندر گم ہو جاتا ہے۔ اسے سامنے کا نوشتہ دیوار نظر نہیں آتا کہ اب ہماری بھی باری آنے والی ہے۔

## قرآن حکیم میں موت کا تذکرہ

موت کے حوالے سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ہمیں قرآن مجید میں بھی کئی پہلوؤں سے یاددہانی کرائی ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کی احادیث مبارکہ میں سے بھی چند ایک کا تذکرہ آپ کے سامنے کر رہا ہوں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ موت خود بخود نہیں آجاتی‘ نہ کسی کے کہنے سے آتی ہے۔ یہ کس کے حکم سے آتی ہے اس حوالے سے سورۂ آل عمران میں فرمایا گیا:

﴿وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ؕ﴾

’’اور کسی جان کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ مر سکے مگر اللہ کے حکم سے۔‘‘

نہ ایک گھڑی پہلے نہ ایک گھڑی بعد میں۔ ایک وقت معیّن ہے‘ جو اللہ کی طرف سے طے شدہ ہے۔ البتہ یہ جو زندگی کی مہلت ہے اس میں:

﴿وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ؕ﴾
(آیت ۱۴۵)

’’جو کوئی صرف دنیا کی زندگی کا بدلہ چاہتا ہے تو ہم اس میں سے اسے دے دیتے ہیں‘ اور جو واقعتاً آخرت کا اجر چاہتا ہے ہم اُسے اس میں سے دیں گے۔‘‘

یہ بات سورۃ البقرۃ میں بھی آئی:



﴿فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ﴿۲۰۰﴾
وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ
النَّارِ ﴿۲۰۰﴾ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۲۰۱﴾﴾

’’لوگوں میں سے وہ بھی ہیں جو یہی کہتے رہتے ہیں کہ اے ہمارے ربّ! ہمیں دنیا ہی میں دے دے‘ اور ایسے لوگوں کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ اور اُن میں سے وہ بھی ہیں جو یہ کہتے ہیں پروردگار! ہمیں اس دنیا میں بھی خیر عطا فرما اور آخرت میں بھی خیر عطا فرما اور ہمیں بچالے آگ کے عذاب سے۔ ان ہی لوگوں کے لیے حصہ ہوگا اُس میں سے جو انہوں نے کمایا۔ اور اللہ جلد حساب چکانے والا ہے۔‘‘

لیکن یہ سب نری دعاؤں سے نہیں ملے گا۔ اُن کے لیے بھی حصہ ہے اس میں سے جو کچھ انہوں نے کمایا۔ جو کوشش کی‘ محنت کی۔ لفظ ’’کسب‘‘ کا ذکر آگے بھی آئے گا۔

مَیں موت سے متعلق اپنے موضوع تک بات کو محدود رکھتے ہوئے آگے بڑھتا ہوں۔

جیسا کہ بانی محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے ہمیں پڑھایا کہ اہم مضامین قرآن مجید میں کم از کم دو یا دو سے زیادہ مرتبہ دہرا کر آتے ہیں۔ یہ بات کہ ہر نفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے‘ قرآن مجید میں تین مرتبہ آئی ہے۔ سب سے پہلے سورۂ آل عمران کی آیت ۱۸۵ میں:

﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ؕ وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ﴾

’’ہر ذی نفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے‘ اور تم کو اپنے اعمال کا پورا پورا بدلہ تو قیامت ہی کے دن دیا جائے گا۔‘‘

یہ دنیا دارالجزا نہیں‘ دارالامتحان ہے‘ بدلہ آخرت میں ملے گا۔ اس بدلے کے نتیجے میں:

﴿فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ؕ﴾

’’پس جو کوئی آگ سے بچالیا گیا اور جنت میں داخل کر دیا گیا تو وہ کامیاب ہو گیا۔‘‘

ہم پتا نہیں کون سی کامیابیوں اور ناکامیوں کے چکر میں پڑے ہوئے ہیں۔ اصل فیصلہ تو جو ہار اور جیت کے فیصلے کا دن ہے ﴿ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ﴾ اس دن طے ہوگا۔ اس دن جسے اللہ نے کامیاب قرار دیا اور اپنے فضل سے‘ اپنی رحمت سے جنت میں داخل کر دیا وہی کامیاب ہے۔ اب اگر اس ٹارگٹ سے کم تر زندگی گزاری جا رہی ہے تو:

﴿وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴿۱۸۵﴾﴾

''اور یہ دنیا کی زندگی سوائے دھوکے کے سامان کے کچھ نہیں۔''

ہاں اگر اس مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر زندگی گزاری جا رہی ہے تو ((اَلدُّنْیَا مَزْرَعَةُ الْآخِرَةِ)) یہی دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ جو یہاں بوئیں گے‘ وہاں کاٹیں گے۔

یہی تذکرہ سورۃ الانبیاء کی آیت ۳۵ میں آیا:

﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ۭ وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً ۭ﴾

''ہر جاندار کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔ اور ہم تمہیں آزماتے رہتے ہیں‘ (تمہارا امتحان لیتے رہتے ہیں) شر سے بھی اور خیر سے بھی۔''

نہ کوئی دنیا کی خیر خیر ہے اور نہ کوئی دنیا کا شر شر ہے۔ دونوں دراصل امتحان ہیں۔ امتحان لینے والا کہہ رہا ہے کہ اس کی مرضی ہے‘ کبھی وہ دے کر آزماتا ہے‘ کبھی لے کر آزماتا ہے۔

﴿وَاِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ۝۳۵﴾

''اور تم سب کو ہماری ہی بارگاہ میں لوٹ کر آنا ہے۔''

شاعر نے کہا کہ ؎

موت سے کس کو رستگاری ہے!
آج وہ‘ کل ہماری باری ہے!

لیکن ہم یہ سبق یاد کرنے کے لیے بہت کم تیار ہوتے ہیں‘ اِلّا ماشاء اللہ۔ پھر سو باتوں کی ایک بات سورۃ القصص میں بھی فرما دی اور سورۃ الرحمٰن میں بھی۔ سورۃ القصص کی آخری آیت میں فرمایا:

﴿كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ۭ لَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝۸۸﴾

''ہر شے ہلاک ہو جانے والی ہے سوائے اُس کے چہرۂ انور کے۔ اختیار و اقتدار اُسی کا ہے اور اُسی کی بارگاہ میں تم سب کے سب لوٹائے جاؤ گے۔''

یہی بات سورۃ الرحمٰن کے آخر میں فرمائی گئی:

﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝۲۶ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ۝۲۷﴾

''جو کوئی بھی اس زمین پر ہے سب فنا ہو جانے والا ہے‘ اور باقی رہنے والا تیرے ربّ ذوالجلال والاکرام کا چہرۂ انور ہے۔''

گویا کہ اس میں کسی کے لیے بھی کوئی استثنا نہیں چاہے کوئی نبی ہو‘ ولی ہو۔ جو آیا ہے‘ جانے کے لیے آیا ہے۔ اسی کو شاعر نے کہا کہ ؎



ہر نفس طوفان ہے‘ ہر سانس ہے اِک زلزلہ
موت کی جانب رواں ہے زندگی کا قافلہ

ہر سانس ہمیں موت کے قریب کر رہا ہے: ؎

مضطرب ہر چیز ہے‘ جنبش میں ہے ارض و سما
ان میں قائم ہے تو تیرے رب کے چہرے کی ضیا

## احادیثِ مبارکہ میں موت کا تذکرہ

موت کو رسول اللہ ﷺ نے سب سے پہلے متعارف کروایا تو وہ اس طرح کہ: ((تُحْفَةُ الْمُؤْمِنِ الْمَوْتُ)) (المستدرک للحاکم: ۷۹۰۰) ''موت مؤمن کے لیے تحفہ ہے۔'' جسے ہم بڑی ناگوار چیز سمجھ رہے ہیں‘ اللہ کے رسول ﷺ اسے مؤمن کے لیے تحفہ قرار دے رہے ہیں۔ اس حدیث کے راوی حضرت عبداللہ بن عمرو ؓ ہیں اور اس کو امام بیہقی نے نقل کیا ہے۔

موت طبعی طور پر کسی کے لیے بھی خوش گوار نہیں ہوتی‘ لیکن اللہ کے جن بندوں کو ایمان و یقین کی دولت نصیب ہے وہ موت کے بعد اللہ تعالیٰ کے انعامات‘ اس کے قربِ خصوصی اور اس کی لذّتِ دیدار پر نظر رکھتے ہوئے منطقی طور پر موت کے مشتاق ہوتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے آنکھ میں سرجری کوئی نہیں کروانا چاہتا لیکن اگر یہ بتایا جائے کہ اس کے نتیجے میں بینائی بہتر ہو جائے گی تو لاکھوں روپے دے کر بھی سرجری کروائی جاتی ہے‘ حالانکہ یہ یقینی بات نہیں ہے کہ بینائی بہتر ہو گی۔ وہ مکمل طور پر جا بھی سکتی ہے۔ البتہ جنہیں اس امر پر اطمینان حاصل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے انعامات‘ اس کا قرب اور اس کی لذتِ دیدار بالکل یقینی ہے تو اس لحاظ سے ان کے لیے موت ایک محبوب ترین تحفہ ہے۔

سیّدنا شداد بن اوس ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اَلْکَیِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهٗ وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ، وَالْعَاجِزُ مَنْ اَتْبَعَ نَفْسَهٗ هَوَاهَا، ثُمَّ تَمَنّٰى عَلَى اللّٰهِ)) (سنن الترمذی: ۲۴۵۹)

''ہوشیار اور دانا وہ ہے جو اپنے نفس کو قابو میں رکھے اور موت کے بعد کے لیے (یعنی آخرت کی نجات اور کامیابی کے لیے) عمل کرے‘ جبکہ نادان اور ناتواں وہ ہے جو (احکامِ خداوندی کے بجائے) اپنے نفس کے تقاضوں پر چلے‘ پھر اللہ سے امیدیں بھی

باندھے (کہ وہ بڑا بخشنے والا ہے)۔‘‘

دنیا میں چالاک‘ ہوشیار اور کامیاب وہ سمجھا جاتا ہے جو دونوں ہاتھوں سے دنیا سمیٹتا ہو‘ جو کرنا چاہے کر سکتا ہو‘ جبکہ بے وقوف و ناتواں وہ سمجھا جاتا ہے جو دنیا کمانے میں تیز اور چالاک نہ ہو۔ اہل دنیا اس فانی زندگی کو سب کچھ سمجھتے ہیں‘ ان کو ایسا سمجھنا بھی چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس حدیث میں بتایا کہ چونکہ اصل زندگی یہ چند روزہ نہیں بلکہ ہمیشہ ہمیش کی زندگی ہے تو اسی کے لیے جو تیاری میں لگا ہے وہ ہوشیار ہے۔

اگلی حدیث امام بخاریؒ نے نقل کی اور اس میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے میرے دونوں مونڈھے پکڑ کر مجھ سے ارشاد فرمایا: ((کُنْ فِی الدُّنْیَا کَاَنَّکَ غَرِیْبٌ اَوْ عَابِرُ سَبِیْلٍ)) (صحیح البخاری:۶۴۱۶) ’’دُنیا میں ایسے رہو جیسے اجنبی یا راستہ چلتا مسافر۔‘‘

کوئی مسافر پردیس کو اور راہ گزر کو اپنا اصلی وطن نہیں سمجھتا۔ ہمارے جو بھائی بیرون ملک جاتے ہیں وہ بڑی مشقت کے ساتھ کمائی کرتے ہیں اور پھر زیادہ سے زیادہ بچانے کی کوشش کرتے ہیں کہ روکھی سوکھی کھا کر اور مشکل حالات میں جی کر یہ تھوڑی سی تنگی کاٹ لیں‘ پھر اپنے وطن میں جائیں گے تو ٹھاٹ سے رہیں گے۔ چنانچہ یہ دنیا بھی ہمارے لیے کچھ ایسی ہی ہے۔ اصل وطن یہ نہیں بلکہ آخرت ہے۔ اس اعتبار سے مؤمن کو چاہیے کہ یہاں ایسی فکر نہ کرے کہ جیسے اس نے ہمیشہ رہنا ہے بلکہ اس کو ایک پردیس اور راہ گزر سمجھ کر زندگی گزارے۔

سیّدنا محمود بن لبیدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِثْنَتَانِ یَکْرَھُھُمَا ابْنُ آدَمَ: یَکْرَہُ الْمَوْتَ وَالْمَوْتُ خَیْرٌ لِلْمُؤْمِنِ مِنَ الْفِتْنَۃِ، وَیَکْرَہُ قِلَّۃَ الْمَالِ وَقِلَّۃُ الْمَالِ اَقَلُّ لِلْحِسَابِ))

(سلسلۃ الاحادیث الصحیحۃ:۱۰۴۹)

’’آدم کا بیٹا دو چیزوں کو ناپسند کرتا ہے: (۱) موت کو ناپسند کرتا ہے‘ حالانکہ موت مومن کے لیے فتنے سے بہتر ہے‘ اور (۲) قلّتِ مال کو ناپسند کرتا ہے‘ حالانکہ مال کی کمی (قیامت والے دن) حساب کے ہلکا ہو جانے کا باعث ہے۔‘‘

یعنی دو چیزیں ایسی ہیں جن کو آدمی ناپسند کرتا ہے حالانکہ ان میں اس کے لیے بہتری ہے۔ ایک تو



وہ موت کو پسند نہیں کرتا حالانکہ موت اس کے لیے فتنہ سے بہتر ہے۔ پہلے ذکر ہوا کہ ﴿وَنَبْلُوْکُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَیْرِ فِتْنَۃً﴾ ’’ہم تمہیں جانچتے رہتے ہیں‘ آزماتے رہتے ہیں شر سے بھی خیر سے بھی بطور آزمائش‘‘۔ زندگی تو ہے ہی آزمائش کا نام۔ ؎

قلزمِ ہستی سے تُو اُبھرا ہے مانندِ حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی!

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ دوسرے وہ مال کی کمی اور ناداری کو پسند نہیں کرتا حالانکہ یہ امر آخرت کے حساب کو بہت مختصر اور ہلکا کر دینے والا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہر آدمی موت سے اور افلاس سے گھبراتا ہے‘ ان سے بچنا چاہتا ہے۔ موت اس لحاظ سے بہت بڑی نعمت ہے کہ مرنے کے بعد آدمی دنیا کے دین سوز فتنوں سے‘ جھمیلوں سے مامون اور محفوظ ہو جاتا ہے۔ مال و دولت کی کمی اس لحاظ سے بڑی نعمت ہے کہ ناداروں اور مفلسوں کو آخرت میں بہت مختصر حساب دینا پڑے گا۔

اللہ کے رسول ﷺ نے اس پر صرف وعظ ہی نہیں فرمایا بلکہ اس پر عمل بھی کر کے دکھایا۔ آپ ﷺ کے پاس مال ایک رات کے لیے بھی نہیں ٹھہرتا تھا‘ مستحقین تک پہنچ جاتا تھا۔ آپ ﷺ دعا کیا کرتے تھے: ((اَللّٰھُمَّ أَحْیِنِیْ مِسْکِیْنًا)) ’’اے اللہ! مجھے مسکینی کی حالت میں زندگی گزارنے کی توفیق عطا فرما۔‘‘ ((وَاَمِتْنِیْ مِسْکِیْنًا)) ’’اور مجھے مسکینی کی حالت میں موت عطا فرمانا۔‘‘ ((وَاحْشُرْنِیْ فِیْ زُمْرَۃِ الْمَسَاکِیْنِ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ)) (سنن الترمذی:۲۳۵۲) ’’اور قیامت کے روز میرا حشر مسکینوں کے ساتھ کرنا‘‘۔ اس لیے کہ ان کا حساب بڑا جلدی ہو جانے والا ہے۔ اگر انسان ان چیزوں کو شعوری طور پر اختیار بھی کرے اور اللہ سے مانگے بھی تو پھر اللہ تعالیٰ عطا بھی فرماتا ہے۔

اگلی حدیث بھی امام ترمذیؒ نے نقل کی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ایک شخص کو نصیحت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

((اِغْتَنِمْ خَمْسًا قَبْلَ خَمْسٍ: شَبَابَکَ قَبْلَ ھَرَمِکَ، وَصِحَّتَکَ قَبْلَ سَقَمِکَ، وَغِنَاکَ قَبْلَ فَقْرِکَ، وَفَرَاغَکَ قَبْلَ شُغْلِکَ، وَحَیَاتَکَ قَبْلَ مَوْتِکَ)) (رواہ الحاکم والبیہقی)

’’پانچ حالتوں کو دوسری پانچ حالتوں کے آنے سے پہلے غنیمت سمجھو۔ جوانی کو بڑھاپے کے آنے سے پہلے‘ تندرستی کو بیمار ہونے سے پہلے‘ خوش حالی اور فراخ دستی کو ناداری اور تنگ دستی سے پہلے‘ جبکہ فرصت اور فراغت کو مشغولیت کے آنے سے پہلے غنیمت جانو‘ اور زندگی کو موت کے آنے سے پہلے غنیمت جانو۔‘‘

اس آخری بات کے لیے یہ حدیث سنائی گئی ہے کہ زندگی کو موت کی تیاری اور موت کے بعد والی زندگی کے لیے استعمال کرو۔

امام ترمذیؒ ہی سے منقول یہ حدیث حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک روز اپنے اصحابؓ سے فرمایا: ((اِسْتَحْيُوْا مِنَ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ حَقَّ الْحَيَاءِ)) ’’اللہ تعالیٰ سے ایسی حیا کیا کرو جیسے اس سے حیا کرنے کا حق ہے۔‘‘ صحابہؓ نے عرض کیا: الحمدللہ‘ ہم اللہ سے حیا کرتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ’’(حیا کا مفہوم اتنا محدود نہیں جتنا تم سمجھ رہے ہو بلکہ) اللہ تعالیٰ سے حیا کرنے کا حق یہ ہے کہ سر اور اس میں جو افکار و خیالات ہیں ان سب کی نگہداشت کرو‘ اور پیٹ کی اور جو کچھ اس میں بھرا ہے اس کی نگرانی کرو (یعنی برے خیالات سے دماغ کی جبکہ حرام اور ناجائز غذا سے پیٹ کی حفاظت کرو)۔ پھر موت اور اس کے بعد قبر میں جو حالت ہونی ہے اس کو یاد کرو۔ جو شخص آخرت کو اپنا مقصد بنائے گا وہ دنیا کی آسائشوں اور عیش و عشرت سے دست بردار ہو جائے گا (اور اس چند روزہ زندگی کے عیش کے مقابلے میں آگے آنے والی زندگی کی کامیابی کو اپنے لیے پسند اور اختیار کرے گا)۔ پس جس نے یہ سب کچھ کیا‘ سمجھو کہ اُس نے اللہ سے حیا کرنے کا حق ادا کیا ہے۔‘‘

اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے حیا کرنے کا حق وہی بندے ادا کر سکتے ہیں جن کی نظر میں اس دنیا اور اس کے عیش و عشرت کی کوئی قیمت نہ ہو۔ دنیا کو ٹھکرا کر آخرت کو سنوارنا ان کا اصل مطمح نظر ہو۔ موت اور اس کے بعد کی منزلیں انہیں ہر وقت یاد رہتی ہوں۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

’’اے لوگو! نہیں ہے کوئی ایسی چیز جو جنت سے تم کو قریب اور دوزخ سے تم کو بعید کرے مگر اس کا حکم میں تم کو دے چکا ہوں‘ اور (اسی طرح) نہیں ہے کوئی ایسی چیز جو دوزخ سے تم کو قریب اور جنت سے بعید کرے مگر میں تم کو اس سے منع کر چکا ہوں (یعنی نیکی اور ثواب کی کوئی بات ایسی نہیں ہے جس کی تعلیم میں نے تم کو نہ دی ہو جبکہ بدی اور گناہ کی



کوئی بات ایسی نہیں ہے جس سے میں نے تم کو منع نہ کر دیا ہو۔ اللہ کے تمام مثبت اور منفی احکام جو مجھے ملے تھے وہ تم کو پہنچا چکا ہوں۔) روح الامین نے (جبکہ ایک روایت میں روح القدس نے —— اور دونوں سے مراد جبریل امین علیہ السلام ہیں) ابھی میرے دل میں یہ بات ڈالی ہے:

((اَنَّ نَفْسًا لَنْ تَمُوْتَ حَتّٰى تَسْتَكْمِلَ رِزْقَهَا، اَلَا فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَجْمِلُوْا فِي الطَّلَبِ، وَلَا يَحْمِلَنَّكُمُ اسْتِبْطَاءُ الرِّزْقِ اَنْ تَطْلُبُوْهُ بِمَعَاصِي اللّٰهِ، فَاِنَّهُ لَا يُدْرَكُ مَا عِنْدَ اللّٰهِ اِلَّا بِطَاعَتِهِ)) (رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

’’یہ کہ کوئی جان اس وقت تک مر نہیں سکتی جب تک کہ اپنے حصے کا رزق مکمل نہ کر لے (موت نہیں آئے گی اس سے پہلے کہ جب تک وہ رزق مکمل نہ ہو جو اللہ نے طے کر دیا ہے۔ جس کے لیے ہم نے صبح و شام ایک کیے ہوئے ہیں‘ یہ سب تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے کہا ہے کہ میں نے طے کر دیا ہے۔ یہ بات آپ ﷺ کے دل میں روح الامین نے اللہ کے حکم سے ڈالی۔ گویا اللہ کی بات آپ ﷺ convey کر رہے ہیں)۔ لہٰذا اے لوگو! اللہ سے ڈرو اور تلاشِ رزق کے سلسلے میں نیکی اور پرہیزگاری کا رویہ اختیار کرو۔ روزی میں کچھ تاخیر ہو جانا تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کر دے کہ تم اللہ کی نافرمانیوں (اور غیر شرعی طریقوں) سے اسے حاصل کرنے کی فکر اور کوشش کرنے لگو‘ کیونکہ جو کچھ اللہ کے قبضے میں ہے وہ اس کی فرماں برداری اور اطاعت گزاری کے ذریعے سے ہی حاصل کیا جا سکتا ہے۔‘‘

یہ حدیث اکثر جمعہ کے خطبوں میں بھی سنائی جاتی ہے۔ اگر صرف اس ایک بات کا یقین ہی حاصل ہو جائے تو جتنی پریشانیاں ہم نے اپنے لیے پال رکھی ہیں ان سب سے نجات حاصل ہو جاتی ہے۔

ایک اور حدیث جس کے راوی حضرت ابوہریرہؓ ہیں‘ اسے امام ترمذیؒ‘ نسائیؒ اور ابن ماجہؒ نے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اَكْثِرُوْا ذِكْرَ هَاذِمِ اللَّذَّاتِ: الْمَوْتُ))

’’لذات کو ختم کرنے والی یعنی موت کو کثرت سے یاد کیا کرو!‘‘

لوگو! موت کو کثرت سے یاد کرو اور یاد رکھو یہ دنیا کی لذتوں کو ختم کر دینے والی ہے۔ اگر انسان واقعی دنیا اور اس کی رنگینیوں میں کھونا نہیں چاہتا تو اسے موت کو کثرت سے یاد رکھنا چاہیے۔ اس

حوالے سے یہ حکایت کے درجے کی بات ہے کہ کسی شخص کی حضرت عزرائیل علیہ السلام جو ملک الموت ہیں' ان سے دوستی ہوگئی۔ اس نے حضرت عزرائیلؑ سے کہا: آپ نے جب میرے پاس آنا ہو تو سال بھر پہلے مجھے بتا دیجیے گا تاکہ میں موت کی کچھ تیاری کرلوں۔ حضرت عزرائیل نے وعدہ فرما لیا لیکن پھر ایک روز اچانک فرمانِ شاہی لے کر پہنچ گئے۔ وہ آدمی ملک الموت کو ایک دم سامنے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ عرض کی: آپ نے تو مجھ سے سال بھر پہلے بتانے کا وعدہ کیا تھا لیکن اب آپ اچانک تشریف لے آئے؟ عزرائیل علیہ السلام نے جواب دیا کہ اس سال کے دوران میں تمہارے فلاں فلاں عزیز' فلاں فلاں رشتہ دار' فلاں فلاں دوست کے پاس آیا اور یہی بتانے کے لیے آتا رہا کہ تیاری کرلو' تمہارے پاس بھی آنے والا ہوں۔ میرا خیال تھا کہ تم کافی عقل مند اور سمجھ دار ہو لیکن تم اتنے ہی احمق اور بے وقوف نکلے کہ سمجھ نہ سکے تو اس میں میرا کیا قصور! یہ جو کسی کے انتقال پر ہم اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ پڑھتے ہیں تو مرنے والے کو ثواب نہیں پہنچا رہے ہوتے بلکہ اس میں یہی یاددہانی ہوتی ہے کہ وہ تو چلا گیا' ہم بھی اللہ کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔

ایک حدیث بخاری اور مسلم دونوں میں آئی ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی کسی دکھ اور تکلیف کی وجہ سے موت کی تمنا اور دعا نہ کرے' اگر وہ بالکل لاچار ہو جائے تو یوں دعا کرے: ((اَللّٰھُمَّ اَحْیِنِیْ مَا کَانَتِ الْحَیَاۃُ خَیْرًا لِیْ وَتَوَفَّنِیْ اِذَا کَانَتِ الْوَفَاۃُ خَیْرًا لِیْ)) ''اے اللہ! مجھے زندگی عطا کیے رکھ جب تک کہ زندگی میرے لیے بہتر ہے اور مجھے وفات دے دیجیو جبکہ فوت ہونا میرے لیے بہتر ہے۔'' یہاں پر بھی اللہ کی مشیت اور اسی کی مرضی کا ذکر ہے۔ اللہ کے علم میں ہے کہ کب تک زندہ رہنا میرے لیے بہتر ہے اور کب میرے لیے فوت ہونا بہتر ہے۔

موت کیا ہے؟ میری موت پر سب سے پہلے مجھ سے جو چھین لیا جائے گا وہ میرا نام ہوگا۔ جب میں مرجاؤں گا تو لوگ کہیں گے کہ میت کہاں ہے! پھر نام نہیں' ڈیڈ باڈی ہوتی ہے۔ مجھے میرے نام سے نہیں پکاریں گے۔ جب نماز جنازہ پڑھانی ہو تو کہیں گے جنازہ لے آؤ' میرا نام نہیں لیں گے۔ جب میرے دفنانے کا وقت آجائے گا تو کہیں گے میت کو قریب کردو' تب بھی کوئی میرا نام نہیں لے گا۔ اس وقت میرا نسب نہ میرا قبیلہ میرے کام آئے گا اور نہ ہی میرا



منصب اور میری شہرت' چاہے دنیا میں مَیں کتنا بھی تیس مار خاں تھا۔ کتنی فانی اور دھوکے کی ہے یہ دنیا جس کی طرف ہم لپکتے ہیں! اے انسان! خوب جان لے کہ تجھ پر غم وافسوس تین طرح کا ہوتا ہے۔ ایک وہ لوگ جو تجھے سرسری طور پر جانتے ہیں' وہ مسکین کہہ کر غم کا اظہار کرتے ہیں۔ دوسرے تیرے دوست چند گھنٹے یا چند روز تیرا غم کریں گے' پھر اپنی باتوں اور ہنسی مذاق میں مشغول ہو جائیں گے۔ زیادہ گہرا زخم تیرے گھر والوں کو' تیرے اہل وعیال کو ہوگا جو ہفتہ' دو ہفتے' مہینہ' دو مہینے یا زیادہ سے زیادہ ایک سال تک ہوگا۔ اس کے بعد وہ بھی تجھے یادوں سے بالکل محو کردیں گے۔ لوگوں کے درمیان تیرا قصہ ختم ہو جائے گا' جبکہ مرنے کے ساتھ ہی آخرت میں تیرا حقیقی قصہ شروع ہو جائے گا۔ وہاں جا کر انسان حسرت سے کہے گا: ﴿یٰلَیْتَنِیْ قَدَّمْتُ لِحَیَاتِیْ ﴿۲۴﴾﴾ (الفجر) ''اے کاش کہ میں نے اپنی اصل زندگی کے لیے کچھ آگے بھیجا ہوتا!'' تجھ سے چھن گیا تیرا جمال' مال' صحت' اولاد۔ جدا ہو گئے تجھ سے مکان' محلات' بیوی غرض ساری دنیا۔ کچھ باقی نہیں رہا تیرے ساتھ سوائے تیرے اعمال کے۔ اب کوئی چیز تیرے کام آنے والی نہیں ہے۔ حقیقی زندگی کا آغاز اب ہوگا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تو نے اپنی قبر اور آخرت کے لیے کہاں تک تیاری کی؟ یہی حقیقت ہے جس کے لیے توجہ کرنی چاہیے۔ اس کے لیے چاہیے کہ اپنے فرائض ادا کیے جائیں۔ ایک فرائض وہ ہیں جو ہم نماز' روزے کی حد تک سمجھتے ہیں۔ فرائضِ دینی کا حقیقی تصور یہ ہے کہ خود بھی اللہ کا بندہ بننا ہے اور دوسروں کو اللہ کی بندگی کی دعوت دینی ہے۔ اللہ کی بندگی والا نظام قائم کرنے کے لیے محنت اور جدّ وجُہد کرنی ہے۔ انسان پوشیدہ اور علانیہ صدقہ جاریہ کرے' نیک کاموں کی کثرت کرے۔ اس یاددہانی کا اثر قیامت کے دن ترازو میں نظر آئے گا۔ اس لحاظ سے انسان کو موت سے ڈرنے کی بھلا کیا ضرورت ہے! ڈرنے سے موت لیٹ تو نہیں ہوتی۔ موت کا علاج موت کی تیاری ہے۔ موت کے بعد کے مراحل کو ذہن میں رکھیے۔ دنیاوی مراحل تو لوگ پورے کرا دیتے ہیں۔ ایک مسلمان کو موت کے بعد نہانے' کفن پہننے اور دفن ہونے کے لیے کوئی زحمت نہیں کرنی پڑے گی۔ لوگ سب کچھ کر دیں گے۔ قبرستان تک صرف چھوڑ کر ہی نہیں آئیں گے بلکہ جو جتنا پیار کرنے والا ہوگا اتنا ہی زیادہ قبر پر مٹی بھی ڈالے گا۔ مٹی ڈال کر قبر کو پکا کر کے دبائیں گے۔ کاش کہ جب زمین پر تھا تو سمجھ لیتا کہ دنیا والوں کے پاس تیرے لیے مٹی

ہی تھی، اور کچھ نہیں۔ ساری زندگی تیری آنکھوں میں دھول جھونکی اور پھر مٹھی بھر مٹّی تیری قبر پر ڈال کر گویا فرض ادا کر دیا۔ بقول ثاقب لکھنوی ؎

مٹھیوں میں خاک لے کے دوست آئے وقت دفن
زندگی بھر کی محبت کا صلا دینے لگے

اور بقول قمر جلالوی ؎

دبا کے قبر میں سب چل دیے، دعا نہ سلام
ذرا سی دیر میں کیا ہو گیا زمانے کو!

یہ فرق جو ہے یہ بھی پیشِ نظر رہے ؎

آدمی کا جسم کیا ہے جس پہ شیدا ہے جہاں
ایک مٹّی کی عمارت، ایک مٹّی کا مکاں
خون کا گارا بنا ہے اینٹ جس میں ہڈیاں
چند سانسوں پہ کھڑا ہے یہ خیالی آسماں
موت کی پُرزور آندھی اس سے جب ٹکرائے گی
یہ عمارت ٹوٹ کر پھر خاک میں مل جائے گی

اور بقول بیدم ؎

یہ جو کچھ دیکھتے ہیں ہم فریبِ خوابِ ہستی ہے
تخیل کے کرشمے ہیں، بلندی ہے نہ پستی ہے
عجب دنیائے حیرت عالمِ گورِ غریباں ہے
کہ ویرانے کا ویرانہ ہے اور بستی کی بستی ہے
وہی ہم تھے کبھی جو رات دن پھولوں میں تلتے تھے
وہی ہم ہیں کہ تربت چار پھولوں کو ترستی ہے

موت کی ایک ریہرسل روزانہ ہمیں اللہ تعالیٰ کراتا ہے جس کا تذکرہ سورۃ الزمر کی آیت ۴۲ میں فرمایا گیا:

﴿اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِہَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِہَا ۚ﴾

’’اللہ ہی جو کسی جان کو وفات دیتا ہے اس کی موت کے وقت، اور جو جان ابھی مرتی



نہیں ہے اس کو وفات دیتا ہے اس کی نیند کی حالت میں۔‘‘

﴿فَیُمْسِکُ الَّتِیْ قَضٰی عَلَیْہَا الْمَوْتَ وَیُرْسِلُ الْاُخْرٰٓی اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ﴾

’’پس جس کی موت کا وہ فیصلہ فرما دیتا ہے، اس کی جان روک لیتا ہے اور دوسری کو واپس بھیج دیتا ہے ایک وقتِ معین تک کے لیے۔‘‘

رات ٹھیک ٹھاک سوئے تھے، صبح دروازے پیٹتے رہے تو پتا چلا کہ جناب تو کتنا عرصہ پہلے فوت ہو چکے ہیں۔ سونے والا جب نیند سے بیدار ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے گویا نئی زندگی نصیب کرتا ہے۔ اس کا فہم وشعور اور اختیار وارادہ واپس آ جاتا ہے اور ایک وقت معین یعنی اس کی موت تک یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔

﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ ﴿۴۲﴾﴾

’’بے شک اس میں نشانیاں ہیں غور وفکر کرنے والوں کے لیے۔‘‘

اللہ کے رسول ﷺ نے ہمیں ان باتوں کی یقین دہانی کتنے خوبصورت انداز میں سکھائی۔

سوتے وقت کی دعا: ((اَللّٰھُمَّ بِاسْمِکَ اَمُوْتُ وَ اَحْیَا)) (صحیح البخاری:۶۳۲۵) ’’اے اللہ! میں تیرے نام کے ساتھ مرتا ہوں اور زندہ ہونا نصیب ہوگا تو وہ بھی تیرے نام کے ساتھ۔‘‘

ہر رات انسان کو شعوری طور پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگ کر اور جیسا کہ اللہ کے رسول ﷺ کا مبارک عمل تھا، باوضو ہو کر سونا چاہیے۔ اس حوالے سے امام بیہقی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے مجھ سے فرمایا: ((یَا بُنَیَّ اِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَکُوْنَ اَبَدًا عَلٰی وُضُوْءٍ فَافْعَلْ)) ’’اے میرے بچے! اگر تمہارے اندر یہ استطاعت ہو کہ تم ہمیشہ باوضو رہو تو ایسا کرو۔‘‘ یہ ہدایت کیا صرف حضرت انسؓ کے لیے ہے؟ کیا ہم آپ ﷺ کے روحانی بیٹے نہیں ہیں؟ کیا آپ ﷺ کا یہ خطاب مجھ سے اور آپ سے نہیں ہے؟ آگے فرمایا: ((فَاِنَّ مَلَکَ الْمَوْتِ اِذَا قَبَضَ رُوْحَ الْعَبْدِ وَھُوَ عَلٰی وُضُوْءٍ کُتِبَ لَہٗ شَھَادَۃً)) ’’بے شک جب ملک الموت کسی شخص کی روح قبض کرتا ہے اور وہ حالت وضو میں ہو تو اُس کے لیے شہادت لکھ دی جاتی ہے۔‘‘ ہم اللہ تعالیٰ سے دعائیں کرتے ہیں: اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنِیْ شَھَادَۃً تو شہادت کے حصول کے لیے جہاں اور کوششیں کرنی ہیں وہاں اللہ کے رسول ﷺ کا بتایا ہوا یہ نسخہ بھی اپنا معمول بنائیں۔ اپنے دل میں ارادہ کریں۔

آج کی اس تذکیر کا کم از کم حاصل یہ ہے کہ رات کو سوتے وقت اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگ کر‘ جتنا حصہ قرآن کا یاد ہے اس میں سے کچھ پڑھ کر اور نبی اکرم ﷺ کے مبارک عمل یعنی آخری تین سورتیں پڑھ کر ہاتھوں پر پھونک مار کر جسم کے اوپر دم کرنا ہے کہ پتا نہیں صبح اٹھنا نصیب ہوگا کہ نہیں۔ سونے کے بعد وضو خطا ہونا ہی ہے لیکن موت آنے کی صورت میں وہ شخص وضو کی حالت میں ہی شمار ہوگا۔ اس لیے دن میں بھی اور رات میں بھی جہاں تک ممکن ہو‘ یہ کریں۔ صبح جب اللہ اپنے فضل سے اٹھنا نصیب کرتا ہے تو یہ ترانہ زبان پر آتا ہے:
((اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَحْیَانَا بَعْدَ مَا اَمَاتَنَا وَاِلَیْہِ النُّشُوْرُ))(صحیح البخاری) ’’ساری تعریف اور سارا شکر اُس اللہ کے لیے ہے جس نے ہمیں زندگی عطا فرمائی اس کے بعد کہ ہم پر موت طاری فرما چکا تھا اور اُسی کی بارگاہ میں لوٹ کر جانا ہے۔‘‘ شعوری طور پر اگر آپ ان دعاؤں کا ترجمہ ذہن میں رکھ کر روزانہ رات کو اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگ کر سوئیں اور صبح اٹھنے پر اللہ کا شکر ادا کریں تو موت کو کثرت سے یاد رکھنے کا ایک عمل جس کے لیے کوئی تردد نہیں کرنا ہے‘ اللہ کے رسول ﷺ نے ہم میں سے ہر ایک کو عطا فرما دیا۔

آخر میں ایک دو باتیں مزید عرض کر کے بات ختم کرتا ہوں۔ جابر بن حیان جو کہ فادر آف کیمسٹری ہے‘ اس نے امام جعفر صادق رحمہ اللہ سے پوچھا: ’’اے استاذ‘ اے فرزند رسول! یہ تو بتائیے کہ موت کیا ہے؟‘‘ امام نے فرمایا: ’’کیا جابر سمجھ سکتا ہے؟‘‘ جابر نے کہا: ’’جی مولا‘ اگر آپ اہل سمجھیں تو سمجھائیں۔‘‘ امام نے فرمایا: ’’جابر! غور سے سن اور سمجھ۔ جب تو ماں کے پیٹ میں تھا تو تاریک پردوں میں رہتا تھا۔ (فِیْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ تین تین پردوں کے اندر‘ قرآن میں ذکر ہے اس کا۔) وہ بہت چھوٹا سا جہاں تھا۔ اِس جہاں کی وسعت اور روشنی تُو نے نہیں دیکھی تھی لیکن اُس تاریک جہاں میں بہت خوش تھا۔ تب تو اس جہاں سے کسی اور جگہ جانا نہیں چاہتا تھا کیونکہ تُو نے اس سے بڑا جہان دیکھا ہی نہیں تھا۔ یہی سبب ہے کہ اِس جہاں میں آتے ہی تُو نے رونا شروع کر دیا۔ تُو سمجھ رہا تھا کہ میں مر رہا ہوں لیکن یہاں والے خوش ہو رہے تھے کہ تُو اس جہاں میں پیدا ہو رہا ہے۔ جب تو یہ جہاں چھوڑ کر اگلے جہاں جائے گا تو وہاں والے خوش ہو رہے ہوں گے کہ جابر پیدا ہو رہا ہے جبکہ یہاں والے رو رہے ہوں گے کہ جابر مر رہا ہے۔ جابر! جسے دنیا پیدائش کہتی ہے وہ اصل میں موت ہے اور جسے دنیا موت کہتی ہے وہ اصل



میں پیدائش ہے۔ جتنا فرق شکم مادر اور اس جہاں میں ہے اتنا ہی فرق اِس جہاں اور اس کے اگلے جہاں میں ہے۔ جیسے تُو اس جہاں میں آ کر واپس نہیں پلٹنا چاہتا ایسے ہی اگلے جہاں کی وسعت کو دیکھ کر پچھلے جہاں میں واپس جانا نہیں چاہے گا۔ جیسے آج کوئی ماں کے پیٹ میں جانا پسند نہیں کرتا ہے ایسے ہی وہاں جا کر یہاں آنا پسند نہیں کرے گا۔ یاد رکھ! جتنا فرق ماں کے پیٹ اور اس جہاں میں ہے اتنا ہی فرق اس جہاں میں اور اگلے جہاں میں ہے اور اتنا ہی فرق اس سے آگے جہاں جنت ہے وہاں پر ہے۔‘‘ اللہ تعالیٰ ہم سب کو یہ یقین اور اس کے تحت زندگی گزارنے کی توفیق عطا فرمائے!

آخر میں ایک بہت جامع دعا پیش ہے:

((اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لَنَا قَبْلَ الْمَوْتِ))

’’اے اللہ! ہم سب کی مغفرت فرما دے موت سے پہلے۔‘‘

((وَارْحَمْنَا عِنْدَ الْمَوْتِ))

’’اور ہم پر رحم فرما موت کے وقت۔‘‘

((وَلَا تُعَذِّبْنَا بَعْدَ الْمَوْتِ))

’’اور ہمیں موت کے بعد عذاب سے دوچار نہ کیجیو۔‘‘

((وَلَا تُحَاسِبْنَا یَوْمَ الْقِیَامَۃِ))

’’اور اے اللہ! قیامت کے دن ہمارا حساب نہ لینا۔‘‘

((اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ))

’’بے شک تو ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔‘‘

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

❁❁❁

موت کی تذکیر و موعظت کے حوالے سے مولانا اشرف علی تھانویؒ کے خلیفہ مجاز خواجہ عزیز الحسن مجذوب کی طویل نظم ’’مراقبۂ موت‘‘ میں سے منتخب اشعار اگلے دو صفحات پر ہدیۂ قارئین کیے جا رہے ہیں!

# ایک دن مرنا ہے' آخر موت ہے!

خواجہ عزیز الحسن مجذوبؒ (سہارن پوری)

بحرِ غفلت یہ تری ہستی نہیں
دیکھ جنّت اِس قدر سستی نہیں
راہ گزر دنیا ہے یہ بستی نہیں
جائے عیش و عشرت و مستی نہیں
ایک دن مرنا ہے' آخر موت ہے
کر لے جو کرنا ہے' آخر موت ہے!

ہو رہی ہے عمر مثلِ برف کم
چپکے چپکے' رفتہ رفتہ' دَم بدم
سانس ہے اک راہ روِ مُلکِ عدم
دفعتاً اِک روز یہ جائے گا تھم
ایک دن مرنا ہے' آخر موت ہے
کر لے جو کرنا ہے' آخر موت ہے!

ہے یہاں سے تجھ کو جانا ایک دن
قبر میں ہو گا ٹھکانا ایک دن
منہ خدا کو ہے دکھانا ایک دن
اب نہ غفلت میں گنوانا ایک دن!



ایک دن مرنا ہے' آخر موت ہے
کر لے جو کرنا ہے' آخر موت ہے!

آخرت کی فکر کرنی ہے ضرور
جیسی کرنی ویسی بھرنی ہے ضرور
عمر اِک دن یہ گزرنی ہے ضرور
قبر میں میّت اُترنی ہے ضرور
ایک دن مرنا ہے' آخر موت ہے
کر لے جو کرنا ہے' آخر موت ہے!

آنے والی کس سے ٹالی جائے گی؟
جان ٹھہری جانے والی' جائے گی
روح رگ رگ سے نکالی جائے گی
تجھ پہ اِک دن خاک ڈالی جائے گی
ایک دن مرنا ہے' آخر موت ہے
کر لے جو کرنا ہے' آخر موت ہے!

عیش کر غافل نہ تُو آرام کر
مال حاصل کر نہ پیدا نام کر
یادِ حق دنیا میں صبح و شام کر!
جس لیے آیا ہے تُو وہ کام کر!
ایک دن مرنا ہے' آخر موت ہے
کر لے جو کرنا ہے' آخر موت ہے!

# حیا بمقابلہ بے حیائی

ریان بن نعمان ☆

یہ امر روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ مغرب میں معاشرتی نظام تباہی و بربادی کی انتہا کو پہنچ چکا ہے۔ بے حیا مغربی تہذیب کے اس بپھرے ہوئے سیلاب نے اب اپنا رخ اسلامی ممالک کی طرف کر لیا ہے۔ مغرب سوشل انجینئرنگ پروگرام اور دوسرے خوش نما ناموں کے ذریعے ہمارے خاندانی نظام کو تباہ و برباد کرنے کے درپے ہے اور بے حیا معاشرے کی تشکیل کی کوششوں میں مصروف ہے۔ بحیثیت اُمّتِ مسلمہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہمارا دینی فریضہ ہے۔ بفحوائے الفاظِ قرآنی:

﴿وَلۡتَكُنۡ مِّنۡكُمۡ اُمَّةٌ يَّدۡعُوۡنَ اِلَى الۡخَيۡرِ وَيَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَيَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ﴿۱۰۴﴾﴾ (آل عمران)

’’اور تم میں سے ایک جماعت ایسی ضرور ہونی چاہیے جو خیر کی طرف دعوت دے، نیکی کا حکم دیتی رہے اور بدی سے روکتی رہے۔ اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔‘‘

والفاظِ حدیثِ رسول ﷺ:

((مَنْ رَاٰى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ، فَاِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ، فَاِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ، وَذٰلِكَ اَضْعَفُ الْاِيْمَانِ)) (صحیح مسلم)

’’تم میں سے جو کوئی کسی برائی کو دیکھے تو اپنے زورِ بازو سے اسے روک دے۔ پھر اگر اس کی طاقت نہ رکھتا ہو تو اپنی زبان سے اسے روکے۔ پھر اگر اس کی استطاعت بھی نہ رکھتا ہو تو اپنے دل سے (اسے برا جانے اور روکنے کی خواہش کرے) اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔‘‘

اس ذمہ داری کے تحت بے حیائی کے سیلاب کے آگے بند باندھنے کی اشد ضرورت ہے۔

☆ قرآن اکیڈمی، کورنگی، کراچی



کسی کام کی اہمیت اور اس کے فضائل کا علم اس کام کو روبعمل لانے میں انشراحِ صدر کا موجب بنتا ہے۔ چنانچہ اوّلاً ہم اسلام میں حیا کی اہمیت و فضیلت جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔

## ✷ حیا کا مقام و مرتبہ

### (۱) حیا: اسلام کا بنیادی وصف

حضرت یزید بن طلحہ بن رکانہ ؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اِنَّ لِكُلِّ شَيْءٍ خُلُقًا، وَخُلُقُ الْاِيْمَانِ الْحَيَاءُ)) (ابن ماجه: ۴۱۸۱)

’’بیشک ہر چیز کا کوئی نہ کوئی خلق (امتیازی وصف) ہوتا ہے اور ایمان کا خلق حیا ہے۔‘‘

### (۲) حیا: ایمان کی ایک شاخ

حضرت ابو ہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اَلْاِيْمَانُ بِضْعٌ وَسَبْعُوْنَ اَوْ بِضْعٌ وَسِتُّوْنَ شُعْبَةً، فَاَفْضَلُهَا قَوْلُ: لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، وَاَدْنَاهَا اِمَاطَةُ الْاَذٰى عَنِ الطَّرِيْقِ، وَالْحَيَاءُ شُعْبَةٌ مِنَ الْاِيْمَانِ)) (رواه البخاری و مسلم (ح۱۵۳) واللفظ له)

’’ایمان کی ستر سے زیادہ، یا فرمایا کہ ساٹھ سے زیادہ شاخیں ہیں، جن میں سے سب سے افضل لا الٰہ الا اللہ کہنا ہے اور سب سے کم راستے سے کسی تکلیف دہ چیز کو ہٹانا ہے، اور حیا بھی ایمان کی ایک شاخ ہے۔‘‘

### (۳) حیا: اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا وصف

حضرت یعلیٰ بن امیہ ؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو بغیر تہ بند کے (میدان میں) نہاتے دیکھا تو آپ ﷺ منبر پر چڑھے اور اللہ کی حمد و ثنا کی، پھر فرمایا:

((اِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ سِتِّيْرٌ يُحِبُّ الْحَيَاءَ وَالسَّتْرَ، فَاِذَا اغْتَسَلَ اَحَدُكُمْ فَلْيَسْتَتِرْ)) (سنن ابی داوٗد، ح۴۰۱۲)

’’اللہ عزوجل حیادار ہے، پردہ پوشی کرنے والا ہے، حیا اور پردہ پوشی کو پسند فرماتا ہے۔ لہٰذا جب تم میں سے کوئی نہائے تو ستر کو چھپا لے۔‘‘

### (۴) حیا: نبی اکرم ﷺ کی صفتِ حمیدہ

حضرت ابوسعید خدری ؓ بیان کرتے ہیں:

كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَشَدَّ حياءً مِنَ العَذْرَاءِ فِيْ خِدْرِهَا، فَإِذَا رَأى شَيْئًا يَكْرَهُهُ عَرَفْنَاهُ فِيْ وَجْهِهٖ (متفق عليه)

’’رسول اللہ ﷺ باپردہ کنواری لڑکی سے بھی زیادہ حیادار تھے۔ جب آپ ﷺ کو کوئی بات ناپسند گزرتی‘ تو ہم اس ناپسندیدگی کے آثار آپ ﷺ کے چہرۂ مبارک پر پہچان جاتے تھے۔‘‘

## (۵) حیا: انبیاء علیہم السلام کی سُنّت

حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اَرْبَعٌ مِنْ سُنَنِ الْمُرْسَلِيْنَ: الْحَيَاءُ، وَالتَّعَطُّرُ، وَالسِّوَاكُ، وَالنِّكَاحُ)) (سنن الترمذی، ح۱۰۸۰)

’’چار باتیں انبیاء ورسل علیہم السلام کی سُنّت میں سے ہیں: حیا کرنا‘ عطر لگانا‘ مسواک کرنا اور نکاح کرنا۔‘‘

## ✷ اسلام میں بے حیائی کی حرمت وشناعت

### (۱) ہر قسم کی بے حیائی حرام

﴿قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ﴾ (الاعراف:۳۳)

’’آپ (ﷺ) فرما دیجیے: بے شک میرے ربّ نے تو بے حیائی کی باتوں کو حرام کیا ہے چاہے وہ ظاہر ہوں یا چھپی ہوئی۔‘‘

### (۲) نفرتِ خداوندی کا موجب

حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَا مِنْ شَيْءٍ اَثْقَلُ فِيْ مِيْزَانِ الْمُؤْمِنِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ خُلُقٍ حَسَنٍ، وَاِنَّ اللّٰهَ لَيُبْغِضُ الْفَاحِشَ الْبَذِيْءَ)) (سنن الترمذی، ح۲۰۰۲)

’’قیامت کے دن مومن کے میزان میں اچھے اخلاق سے زیادہ وزنی کوئی چیز نہیں ہوگی‘ اس لیے کہ بے حیا اور فحش گو شخص سے اللہ تعالیٰ نفرت کرتا ہے۔‘‘

### (۳) قہرِ الٰہی و کبیرہ گناہوں کا سبب

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:



((اِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ اِذَا اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ عَبْدًا نَزَعَ مِنْهُ الْحَيَاءَ، فَإِذَا نَزَعَ مِنْهُ الْحَيَاءَ لَمْ تَلْقَهُ اِلَّا مَقِيتًا مُمَقَّتًا، فَإِذَا لَمْ تَلْقَهُ اِلَّا مَقِيتًا مُمَقَّتًا نُزِعَتْ مِنْهُ الْاَمَانَةُ، فَإِذَا نُزِعَتْ مِنْهُ الْاَمَانَةُ لَمْ تَلْقَهُ اِلَّا خَائِنًا مُخَوَّنًا، فَإِذَا لَمْ تَلْقَهُ اِلَّا خَائِنًا مُخَوَّنًا نُزِعَتْ مِنْهُ الرَّحْمَةُ، فَإِذَا نُزِعَتْ مِنْهُ الرَّحْمَةُ لَمْ تَلْقَهُ اِلَّا رَجِيمًا مُلَعَّنًا، فَإِذَا لَمْ تَلْقَهُ اِلَّا رَجِيمًا مُلَعَّنًا نُزِعَتْ مِنْهُ رِبْقَةُ الْاِسْلَامِ)) (سنن ابن ماجه، ح۴۰۵۴)

’’اللہ تعالیٰ جب کسی بندے کو ہلاک کرنا چاہتا ہے تو اس سے شرم وحیا کو نکال لیتا ہے‘ پھر جب حیا اُٹھ جاتی ہے تو وہ اللہ کے قہر میں گرفتار ہو جاتا ہے‘ اور اس حالت میں اس سے امانت بھی چھین لی جاتی ہے‘ اور جب اس سے امانت چھین لی جاتی ہے تو وہ چوری اور خیانت شروع کر دیتا ہے‘ اور جب چوری اور خیانت شروع کر دیتا ہے تو اس سے رحمت چھین لی جاتی ہے‘ اور جب اس سے رحمت چھین لی جاتی ہے تو تم اسے ملعون و مردود پاؤ گے‘ اور جب تم اُسے ملعون و مردود دیکھو تو سمجھ لو کہ اسلام کا قلادہ اس کی گردن سے نکل چکا ہے۔‘‘

### (۴) جنسِ مخالف کی مشابہت: لعنتِ رسول ﷺ کی وجہ

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں:

لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ الْمُتَشَبِّهِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ بِالنِّسَاءِ، وَالْمُتَشَبِّهَاتِ مِنَ النِّسَاءِ بِالرِّجَالِ (صحیح البخاری، ح۵۸۸۵)

’’رسول اللہ ﷺ نے لعنت فرمائی ہے ان مردوں پر جو عورتوں سے مشابہت اختیار کرتے ہیں اور اُن عورتوں پر جو مردوں سے مشابہت اختیار کرتی ہیں۔‘‘

## ✷ حیا کا جامع تصوّر

حیا اپنے معنی اور تعریف کے لحاظ سے فقط اس مفہوم تک محدود نہیں جو ہماری اکثریت کے ذہن میں موجود ہے کہ صرف عریانی و برہنگی ہی سے بچنے کا نام حیا ہے‘ بلکہ یہ زندگی کے ہر شعبے سے متعلق ہے۔ حیا تو بندہ مؤمن کی پوری زندگی سے عبارت ہے۔ چنانچہ نبی مکرم ﷺ نے مندرجہ ذیل روایت میں حیا کے جامع تصور کو واضح فرمایا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے

مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ایک روز اپنے اصحابؓ سے ارشاد فرمایا:

((اِسْتَحْيُوا مِنَ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ حَقَّ الْحَيَاءِ)) قَالَ قُلْنَا: يَا رَسُولَ اللّٰهِ إِنَّا نَسْتَحْيِي مِنَ اللّٰهِ يَا نَبِيَّ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ، قَالَ: ((لَيْسَ ذٰلِكَ وَلٰكِنَّ مَنِ اسْتَحْيَى مِنَ اللّٰهِ حَقَّ الْحَيَاءِ فَلْيَحْفَظِ الرَّأْسَ وَمَا وَعَى، وَلْيَحْفَظِ الْبَطْنَ وَمَا حَوَى، وَلْيَذْكُرِ الْمَوْتَ وَالْبِلٰى، وَمَنْ اَرَادَ الْآخِرَةَ تَرَكَ زِينَةَ الدُّنْيَا، فَمَنْ فَعَلَ ذٰلِكَ فَقَدِ اسْتَحْيَى مِنَ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ حَقَّ الْحَيَاءِ))

(مسند احمد، ح۱۷۴۹)

''اللہ سے اس طرح حیا کرو جیسے حیا کرنے کا حق ہے۔'' ہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! (ﷺ) الحمد للہ' ہم اللہ سے حیا کرتے ہیں۔ فرمایا: ''یہ مطلب نہیں' بلکہ جو شخص اللہ سے اس طرح حیا کرتا ہے جیسے حیا کرنے کا حق ہے تو اسے چاہیے کہ اپنے سر اور اس میں آنے والے خیالات' اپنے پیٹ اور اس میں بھرنے والی چیزوں کا خیال رکھے۔ موت کو اور بوسیدگی کو یاد رکھے۔ جو شخص آخرت کا طلب گار رہتا ہے وہ دنیا کی زیب و زینت چھوڑ دیتا ہے' اور جو شخص یہ کام کرلے' درحقیقت اس نے صحیح معنی میں اللہ عزوجل سے حیا کرنے کا حق ادا کر دیا۔''

## ✷ حیا میں مُلبّس شخصیات کا نقشہ

### حضرت اُمِّ خلاد ؓ

حضرت قیس بن شماس ؓ سے روایت ہے:

جَاءَتِ امْرَأَةٌ اِلَى النَّبِيِّ ﷺ يُقَالُ لَهَا أُمُّ خَلَّادٍ، وَهِيَ مُنْتَقِبَةٌ، تَسْأَلُ عَنِ ابْنِهَا وَهُوَ مَقْتُولٌ، فَقَالَ لَهَا بَعْضُ أَصْحَابِ النَّبِيِّ ﷺ: جِئْتِ تَسْأَلِينَ عَنِ ابْنِكِ وَأَنْتِ مُنْتَقِبَةٌ! فَقَالَتْ: إِنْ أُرْزَأَ ابْنِي فَلَنْ أُرْزَأَ حَيَائِي، فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: ((ابْنُكِ لَهُ أَجْرُ شَهِيدَيْنِ)) قَالَتْ: وَلِمَ ذَاكَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ؟ قَالَ: ((لِأَنَّهُ قَتَلَهُ أَهْلُ الْكِتَابِ)) (سننِ ابی داؤد، ح۲۴۸۸)

''رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک عورت حاضر ہوئی۔ اس کا نام اُمِّ خلاد تھا اور اس کے چہرے پر نقاب پڑا ہوا تھا۔ یہ عورت اپنے بیٹے کے بارے میں دریافت کر رہی تھی جو جنگ میں شہید ہو گیا تھا۔ اصحابِ رسول ﷺ میں سے کسی نے اس سے کہا کہ تم اپنے



بیٹے کو ڈھونڈ رہی ہو اور اس حال میں سر اور چہرہ ڈھکا ہوا ہے! (یعنی پوری طرح اپنے حواس میں ہو اور احکامِ شریعت کی پابندی برقرار ہے)۔ وہ بولی: اگر میرا بیٹا بھی جاتا رہا تب بھی اپنی حیا نہیں جانے دوں گی۔ آپ ﷺ نے اس عورت سے فرمایا: ''تیرے بیٹوں کو دو شہیدوں کے برابر ثواب ملے گا۔'' اس نے پوچھا: اے اللہ کے رسول ﷺ وہ کیوں؟ آپ (ﷺ) نے فرمایا: کیونکہ اس کو اہلِ کتاب نے قتل کیا ہے۔''

### حضرت عثمان ابن عفان ؓ

أَنَّ عَائِشَةَ قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ مُضْطَجِعًا فِي بَيْتِي كَاشِفًا عَنْ فَخِذَيْهِ أَوْ سَاقَيْهِ، فَاسْتَأْذَنَ أَبُوبَكْرٍ، فَأَذِنَ لَهُ وَهُوَ عَلٰى تِلْكَ الْحَالِ فَتَحَدَّثَ، ثُمَّ اسْتَأْذَنَ عُمَرُ، فَأَذِنَ لَهُ وَهُوَ كَذٰلِكَ فَتَحَدَّثَ، ثُمَّ اسْتَأْذَنَ عُثْمَانُ، فَجَلَسَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ وَسَوّٰى ثِيَابَهُ، [قَالَ مُحَمَّدٌ: وَلَا أَقُولُ ذٰلِكَ فِي يَوْمٍ وَاحِدٍ] فَدَخَلَ فَتَحَدَّثَ، فَلَمَّا خَرَجَ قَالَتْ عَائِشَةُ: دَخَلَ أَبُو بَكْرٍ فَلَمْ تَهْتَشَّ لَهُ وَلَمْ تُبَالِهِ، ثُمَّ دَخَلَ عُمَرُ فَلَمْ تَهْتَشَّ لَهُ وَلَمْ تُبَالِهِ، ثُمَّ دَخَلَ عُثْمَانُ فَجَلَسْتَ وَسَوَّيْتَ ثِيَابَكَ، فَقَالَ: ((أَلَا أَسْتَحِي مِنْ رَجُلٍ تَسْتَحِي مِنْهُ الْمَلَائِكَةُ!)) (صحیح مسلم، ح۱۷۰۸)

''سیدہ عائشہ صدیقہ (ؓ) فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اپنے گھر میں لیٹے ہوئے تھے اس حال میں کہ آپ کی رانیں یا پنڈلیاں مبارک کھلی ہوئی تھیں۔ (اسی دوران) حضرت ابوبکر (ؓ) نے اجازت مانگی تو آپ ﷺ نے ان کو اجازت عطا فرما دی اور آپ اسی حالت میں لیٹے باتیں کرتے رہے۔ پھر حضرت عمر (ؓ) نے اجازت مانگی تو آپ ﷺ نے ان کو بھی اجازت عطا فرما دی اور آپ اسی حالت میں باتیں کرتے رہے۔ پھر حضرت عثمان (ؓ) نے اجازت مانگی تو رسول اللہ (ﷺ) بیٹھ گئے اور اپنے کپڑوں کو سیدھا کر لیا۔ [راوی محمد کہتے ہیں کہ میں نہیں کہتا کہ یہ ایک ہی دن کی بات ہے۔] پھر حضرت عثمان (ؓ) اندر داخل ہوئے اور باتیں کرتے رہے' تو جب وہ نکل گئے تو حضرت عائشہ (ؓ) نے فرمایا: حضرت ابوبکر (ؓ) آئے تو آپ ﷺ نے کچھ خیال نہیں کیا اور نہ کوئی پروا کی' پھر حضرت عمر (ؓ) تشریف لائے تو بھی آپ ﷺ نے کچھ خیال نہیں کیا اور نہ ہی کوئی پروا کی' پھر حضرت عثمان (ؓ) آئے تو آپ ﷺ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور آپ نے اپنے کپڑوں کو درست کیا! تو

آپ ﷺ نے فرمایا: (اے عائشہ!) کیا میں اس آدمی سے حیا نہ کروں کہ جس سے فرشتے بھی حیا کرتے ہیں!''

## حیا کی اقسام

حیا انسانوں سے بھی ہوتی ہے اور خدا تعالیٰ سے بھی۔ اسی لیے جب کوئی شخص بُرائی کا ارادہ کرتا ہے تو وہ چھپ کر کرتا ہے' کیونکہ اسے انسانوں سے حیا آتی ہے کہ اگر وہ دیکھ لیں گے تو کیا ہوگا۔ خدا تعالیٰ اگرچہ نظر نہیں آتا' مگر جب یہ یقین ہو جائے کہ اس کی نظر سے کوئی فعل پوشیدہ نہیں ہے تو پھر ذرہ بھر بھی خوفِ خدا رکھنے والا شخص فعلِ قبیح کے ارتکاب کے وقت اللہ تعالیٰ سے حیا کرے گا' اگرچہ کوئی دوسرا انسان اس کو نہ دیکھ رہا ہو۔

حیا کی ایک قسم حیاءِ عبودیت ہے۔ ایک عابد و زاہد اپنی تمام قوتیں اللہ تعالیٰ کی عبادت میں صرف کرنے کے باوجود یہی سمجھتا ہے کہ وہ اس کی عبادت کا حق ادا نہیں کر سکا۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر جس قدر انعامات کیے ہیں' اگر وہ ساری عمر بھی عبادت میں لگا دے' یعنی پیدائش کے وقت ہی اللہ تعالیٰ اس کو فہم عطا کرے اور سجدے میں گر جائے اور ساری عمر اسی ایک سجدہ میں گزار دے اور وہیں اس کی موت آجائے تو وہ بارگاہِ ربّ العزت میں عرض کرے گا کہ: مولیٰ کریم! میں تیری عبادت کا حق ادا نہیں کر سکا۔ حیاءِ عبودیت اسی چیز کا نام ہے۔ خود رسولِ اکرم ﷺ کی دعاؤں میں یہ الفاظ ملتے ہیں: ((سُبْحَانَکَ رَبِّیْ، مَا عَبَدْنَاکَ حَقَّ عِبَادَتِکَ)) (متفق علیہ) ''تیری ذات پاک ہے اے میرے ربّ! ہم تیری اس طرح عبادت نہ کر سکے جیسا کہ تیری عبادت کا حق ہے۔''

حیا خود اپنے نفس سے بھی ہوتی ہے۔ جب اسے کوئی شخص دیکھنے والا نہ ہو تو بعض اوقات انسان خود اپنے جی میں شرم محسوس کرنے لگتا ہے کہ میں کیا کر رہا ہوں اور کسے دھوکا دے رہا ہوں۔ یہ نفس کی حیا ہے۔

حیا کی ایک قسم حیاءِ اکرام ہے۔ خود حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا واقعہ ہے کہ آپ ﷺ نے بعض صحابہؓ کو کھانے پر بلایا۔ کھانا کھا چکنے کے بعد وہ لوگ وہیں بیٹھ کر بات چیت کرنے لگے۔ یہ چیز حضور ﷺ کو ناگوار گزری' مگر آپ نے حیاءِ اکرام کی وجہ سے انہیں زبانِ مبارک سے کچھ نہ کہا بلکہ اٹھ کر باہر چلے گئے تاکہ یہ لوگ بھی چلے جائیں۔ تاہم وہ بیٹھے رہے اور باتیں کرتے



رہے' حتیٰ کہ حضور علیہ السلام پھر تشریف لے آئے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آیات نازل فرمائیں:

﴿ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتَ النَّبِیِّ اِلَّآ اَنْ یُّؤْذَنَ لَکُمْ اِلٰی طَعَامٍ غَیْرَ نٰظِرِیْنَ اِنٰىهُ ۙ وَلٰکِنْ اِذَا دُعِیْتُمْ فَادْخُلُوْا فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا وَلَا مُسْتَاْنِسِیْنَ لِحَدِیْثٍ ؕ اِنَّ ذٰلِکُمْ کَانَ یُؤْذِی النَّبِیَّ فَیَسْتَحْیٖ مِنْکُمْ ۫ وَاللّٰهُ لَا یَسْتَحْیٖ مِنَ الْحَقِّ ؕ ﴾ (الاحزاب:۵۳)

''اے اہلِ ایمان! مت داخل ہوجایا کرو نبی (ﷺ) کے گھروں میں مگر یہ کہ تمہیں کسی کھانے پر آنے کی اجازت دی جائے' نہ انتظار کرتے ہوئے کھانے کی تیاری کا' ہاں جب تمہیں بلایا جائے تب داخل ہوا کرو' پھر جب کھانا کھا چکو تو منتشر ہو جایا کرو اور باتوں میں لگے ہوئے بیٹھے نہ رہا کرو۔ تمہاری یہ باتیں نبی (ﷺ) کے لیے تکلیف کا باعث تھیں مگر وہ (نبی ﷺ) آپ لوگوں سے جھجک محسوس کرتے ہیں' اور اللہ حق (بیان کرنے) سے نہیں جھجکتا۔''

اس آیت کی تفسیر میں صوفی عبدالمجید سواتی لکھتے ہیں:

''جب نبی علیہ السلام کے گھر پر کھانا کھانے کے لیے جاتے ہو تو وہاں بیٹھ کر بات چیت میں وقت نہ گزارو۔ اللہ تعالیٰ کا نبی تو حیاءِ اکرام کی وجہ سے تمہیں نہیں کہتا' مگر تم خود ہی احساس کرو اور کھانا کھا کر واپس چلے جایا کرو۔ بے شک اللہ تعالیٰ حق بات کہنے سے نہیں شرماتا۔'' (تفسیر معالم العرفان فی دروس القرآن)

عربی زبان کا ایک مقولہ ہے: تُعْرَفُ الْاَشْیَاءُ بِاَضْدَادِھَا (چیزیں اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہیں)۔ دنیا میں بہت سی متضاد چیزیں ہیں جن سے انسان کو واسطہ پڑتا ہے۔ یہ متضاد چیزیں تاثیر و نتائج کے اعتبار سے جدا جدا ہوتی ہیں' جیسے دن اور رات' سچ اور جھوٹ' حزب اللہ اور حزب الشیطان' رحمان اور شیطان' روح اور بدن۔ رحمان اپنے ماننے والوں کے اندر کچھ اوصاف دیکھنا چاہتا ہے' اسی طرح شیطان بھی اپنے پیروکاروں میں کچھ خصلتیں پیدا کرنا چاہتا ہے۔ انہی متضاد اشیاء میں حیا اور بے حیائی بھی ہے۔

## حیا و بے حیائی کی تعریف

حیا کے لغوی معنی وقار' سنجیدگی اور متانت کے ہیں۔ اس سے مراد وہ پاکیزہ جذبہ ہے جو انسان کو برائیوں سے عار دلائے۔ چنانچہ حیا کی اصطلاحی تعریف یوں کی جاتی ہے: اَلْحَیَاءُ

اِنْقِبَاضُ النَّفْسِ عَنِ الْقَبَائِحِ وَتَرْکُه (امام راغب اصفہانی فی مفردات القرآن) یعنی ’’حیا وہ وصف ہے جس کی وجہ سے برا کام کرنے سے نفس میں تنگی محسوس ہوتی ہے۔‘‘

بے حیائی کی لغوی تعریف یہ ہے: ’’ہر وہ چیز جو حد سے باہر نکل جائے‘ فحش ہے۔‘‘

اصطلاحاً: ما عَظُمَ قُبْحُه من الأفعالِ والأقوالِ (امام راغب اصفہانی فی مفردات القرآن) یعنی ’’وہ اقوال اور افعال جو قباحت میں حد سے بڑھے ہوئے ہوں۔‘‘

## ٭ حیا کی جزا اور بے حیائی کی سزا

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((الْحَيَاءُ مِنَ الْإِيمَانِ وَالْإِيمَانُ فِي الْجَنَّةِ، وَالْبَذَاءُ مِنَ الْجَفَاءِ وَالْجَفَاءُ فِي النَّارِ)) (سنن الترمذی، ح ۲۰۹۷)

’’حیا ایمان کا جز/پھل ہے اور ایمان کا مقام جنت ہے‘ اور بے حیائی بدکاری میں سے ہے اور بدی جہنم میں لے جانے والی ہے۔‘‘

## خیر و شر کا دروازہ

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((الْحَيَاءُ لَا يَأْتِي إِلَّا بِخَيْرٍ)) (متفق علیه)

’’حیا صرف خیر ہی لاتی ہے۔‘‘

مراد یہ ہے کہ حیا شخصیت میں نیکی ہی لاتی ہے جبکہ بے حیائی ہر شر کا دروازہ کھولتی ہے‘ گفتار و کردار میں پستی لاتی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((إِنَّ مِمَّا أَدْرَكَ النَّاسُ مِنْ كَلَامِ النُّبُوَّةِ الْأُولَى إِذَا لَمْ تَسْتَحْيِ فَاصْنَعْ مَا شِئْتَ)) (صحیح البخاری)

’’اگلے پیغمبروں کا کلام جو لوگوں کو ملا اس میں یہ بھی ہے کہ جب تم میں شرم ہی نہ رہی تو پھر جو جی چاہے وہ کرے۔‘‘

اسی پیغمبرانہ حکمت پر مبنی فارسی کی مشہور کہاوت ہے: ’’بے حیا باش و ہر چہ خواہی کن!‘‘ (ایک مرتبہ بے حیا بن جاؤ‘ پھر جو چاہے کرتے پھرو!)



## حیا اور بے حیائی کے اثرات

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَا كَانَ الْفُحْشُ فِي شَيْءٍ إِلَّا شَانَهُ وَمَا كَانَ الْحَيَاءُ فِي شَيْءٍ إِلَّا زَانَهُ)) (سنن الترمذی، ح ۲۰۶۰)

’’بے حیائی جس چیز میں آتی ہے اسے عیب دار بنا دیتی ہے‘ اور حیا جس چیز میں آتی ہے اسے مزین کر دیتی ہے۔‘‘

## رحمان کی دعوت بمقابلہ شیطان کی دعوت

بے حیائی سے بچنا رحمان کی دعوت ہے جس کا ذکر سورۃ النحل میں کچھ اس طرح آتا ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْیِ ۚ یَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿٩٠﴾﴾

’’بے شک اللہ حکم فرماتا ہے عدل کا اور احسان کا اور رشتہ داروں کو (حقوق) دینے کا‘ اور وہ منع فرماتا ہے بے حیائی سے‘ بُرائی اور ظلم (وسرکشی) سے۔ وہ تمہیں نصیحت فرماتا ہے تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔‘‘

بے حیائی شیطان کی دعوت اور حکم ہے جو سورۃ البقرہ میں یوں بیان ہوا:

﴿اِنَّمَا یَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَی اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿١٦٩﴾﴾

’’بے شک وہ (شیطان) تو تمہیں صرف بُرائی اور بے حیائی کا ہی حکم دیتا ہے اور یہ کہ تم اللہ کی طرف ایسی باتیں منسوب کرو جو تم نہیں جانتے۔‘‘

## رحمان کے بندے بمقابلہ شیطان کے بندے

رحمان کے بندوں کا اجتنابِ فواحش و کبائر کا وصف سورۃ الشوریٰ میں یوں بیان ہوا:

﴿وَالَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ یَغْفِرُوْنَ ﴿٣٧﴾﴾

’’اور وہ لوگ جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے بچتے ہیں اور جب اُنہیں غصہ آتا ہے (تو) معاف کر دیتے ہیں۔‘‘

بندہ مؤمن کے بنیادی وصف کے طور پر سورۃ المؤمنون میں یوں نمایاں کیا گیا:

﴿وَالَّذِیۡنَ هُمۡ لِفُرُوۡجِهِمۡ حٰفِظُوۡنَ ۝۵ اِلَّا عَلٰۤی اَزۡوَاجِهِمۡ اَوۡ مَا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُهُمۡ فَاِنَّهُمۡ غَیۡرُ مَلُوۡمِیۡنَ ۝۶﴾

’’اور وہ لوگ جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں‘ سوائے اپنی بیویوں یا کنیزوں کے جن کے وہ مالک ہیں تو ان پر کوئی ملامت نہیں۔‘‘

بندہ مؤمن کے تکمیلی اوصاف میں بھی یوں مذکور ہے:

﴿وَالَّذِیۡنَ لَا یَدۡعُوۡنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا یَقۡتُلُوۡنَ النَّفۡسَ الَّتِیۡ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالۡحَقِّ وَلَا یَزۡنُوۡنَ ۚ وَمَنۡ یَّفۡعَلۡ ذٰلِکَ یَلۡقَ اَثَامًا ۝۶۸﴾

’’اور وہ جو اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہیں پوجتے اور نہ ہی اللہ کی حرام کی ہوئی جان کو ناحق قتل کرتے ہیں اور نہ (ہی) وہ زنا کرتے ہیں۔ اور جو شخص یہ کام کرے گا وہ اپنے گناہ کا بدلہ پائے گا۔‘‘

سہواً ارتکابِ فواحش کے فوراً بعد توبہ اور اس گناہ پر عدمِ اصرار کا ذکر سورۂ آلِ عمران میں یوں آیا ہے:

﴿وَالَّذِیۡنَ اِذَا فَعَلُوۡا فَاحِشَۃً اَوۡ ظَلَمُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ ذَکَرُوا اللّٰهَ فَاسۡتَغۡفَرُوۡا لِذُنُوۡبِهِمۡ ۪ وَمَنۡ یَّغۡفِرُ الذُّنُوۡبَ اِلَّا اللّٰهُ ۪۟ وَلَمۡ یُصِرُّوۡا عَلٰی مَا فَعَلُوۡا وَهُمۡ یَعۡلَمُوۡنَ ۝۱۳۵﴾

’’اور وہ لوگ جب کوئی بے حیائی کا کام کر بیٹھیں یا اپنی جانوں پر ظلم کر بیٹھیں تو (فوراً) اللہ کو یاد کرتے ہیں اور اپنے گناہوں کے لیے بخشش مانگتے ہیں۔ اور کون ہے جو اللہ کے سوا گناہوں کو بخشے! اور جو اُن سے سرزد ہوا وہ اُس پر جانتے بُوجھتے اَڑے نہیں رہتے۔‘‘

جبکہ اس کے برعکس شیطان کے بندوں کا اشاعتِ فواحش کا وصف سورۃ النور میں یوں وارد ہوا:

﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ یُحِبُّوۡنَ اَنۡ تَشِیۡعَ الۡفَاحِشَۃُ فِی الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَهُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ۙ فِی الدُّنۡیَا وَالۡاٰخِرَۃِ ؕ وَاللّٰهُ یَعۡلَمُ وَاَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ۝۱۹﴾

’’بے شک جو لوگ پسند کرتے ہیں کہ اہلِ ایمان میں بے حیائی پھیلے اُن کے لیے دُنیا و آخرت میں دردناک عذاب ہے۔ اور اللہ جانتا ہے‘ تم نہیں جانتے۔‘‘

## ✷ باحیا اسلامی معاشرہ بمقابلہ بے حیا مغربی معاشرہ

اسلام نے حیا کے نفوذ کے لیے ہمہ جہتی اقدامات کیے ہیں۔ ربّ کائنات نے لباس جیسی



انمول نعمت عطا فرمائی جو ساتر بھی ہے اور موجبِ زینت بھی۔ بے حیائی کی ابتدا ہی سے بیخ کنی کے لیے عورت و مرد کا علیحدہ دائرہ کار مقرر کیا۔ مرد کو اس کی جسمانی ساخت کے پیشِ نظر معاش کی ذمہ داری دی کہ وہ حال کی فکر کرے۔ اسی طرح اس کو گھر کا کفیل بنایا۔ معاشی جِدّ و جُہد اور مضبوط جسمانی ساخت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس کو قوام اور سربراہِ خاندان بنایا۔ عورت کو تربیتِ اولاد کی ذمہ داری دے کر معاشرے کا مستقبل سنوارنے کا فریضہ سونپا گیا۔ مزید برآں‘ محرم ونامحرم کی تقسیم کی گئی۔ حیا کا معاملہ چونکہ عورت سے زیادہ متعلق ہے‘ لٰہذا محرم مَردوں کے سامنے عورت کے گھر کے پردے یعنی ستر کے احکامات سورۃ النور میں بیان ہوئے جبکہ نامحرم مَردوں کے سامنے گھر سے باہر کے پردے یعنی حجاب کے احکامات سورۃ الاحزاب میں وارد ہوئے۔ زنا کی طرف لے جانے والے دروازوں اور محرکات کا سدِ باب کیا گیا‘ مثلاً شراب‘ موسیقی‘ مخلوط کلچر کو ممنوع قرار دیا گیا۔ ساتھ ہی آنکھ‘ کان‘ زبان‘ ہاتھ اور پاؤں کے نامحرم کی طرف التفات کو ان اعضاء کا زنا قرار دیا گیا (مفہومِ حدیث)۔ چار گواہوں کی عدم موجودگی میں زنا کی تہمت لگانے پر حدِ قذف کا اجراء کر کر اشاعتِ فاحشہ کی روک تھام کی گئی (سورۃ النور)۔ گویا ابتداء ہی سے ذہنی تربیت اور مختلف النوع بندشوں کے ذریعے بے حیائی کی بیخ کنی کی گئی۔ سماجی ومعاشرتی سطح پر امن وسکون اور عفت و پاک دامنی کے تحفظ کو یقینی بنایا گیا۔ ان تمام اقدامات کے باوجود اگر کوئی بدبخت اسلامی معاشرے میں زنا کا ارتکاب کرتا ہے تو اس پر سخت ترین سزا مقرر کی گئی ہے (غیر شادی شدہ زانی/ زانیہ کے لیے سو کوڑے اور شادی شدہ زانی/ زانیہ کو رجم کی سزا) تاکہ ایک کو سزا ہو اور سو کو عبرت حاصل ہو۔

اس کے برعکس اگر ہم مغربی معاشرے کا جائزہ لیں تو کہ وہاں خاندانی نظام تہ و بالا نظر آتا ہے۔ آزادی کے دلفریب نعرے درحقیقت شرم وحیا سے آزادی کے نعرے ہیں۔ لباس کے ’’تکلّف‘‘ سے آزادی کے نعرے ہیں۔ بے راہ روی ونفس پرستی کے نعرے ہیں۔ عورت کو کم سے کم لباس پر لاکر‘ اشتہاروں اور مارکیٹ کی زینت بنا کر‘ چراغِ خانہ کو شمعِ محفل بنا کر‘ آزادی کے نام پر عورت کی عفت وعصمت وعظمت کو تار تار کیا گیا۔ آزادیٔ نسواں کے یہ نعرے کھوکھلے اور مغرب کے دوغلے پن کا مظہر ہیں۔ وہاں کسی خاتون کو حجاب لینے کی (قانوناً/ اخلاقاً) آزادی کیوں نہیں؟ کسی باحیا مرد کا رہنا وہاں اجیرن کیوں ہے؟ ایک باحیا فرد اُن کی بے حیائی پر مبنی

اقدار واطوار اور انڈسٹریز کو عملاً ٹھوکر مارتا ہے۔ فحاشی کی قانونی واخلاقی سرپرستی کر کے مغرب ایک حیوانی اور حیا باختہ معاشرے کا نقشہ پیش کر رہا ہے۔ یہ حیوانیت وعریانی وہاں اس درجے کو پہنچ چکی ہے اور اس کے انتہائی مضر' گھناؤنے اور دُور رَس نتائج اس قدر مبرہن ہو رہے ہیں کہ اب ان کے بڑوں کے بھی چودہ طبق روشن ہو رہے ہیں۔ سابق صدر امریکہ بِل کلنٹن کے الفاظ ہیں کہ عنقریب امریکی آبادی کی اکثریت ناجائز بچوں پر مشتمل ہوگی۔ فروری ۲۰۱۳ء میں اسٹیٹ آف دی یونین ایڈریس کے موقع پر سابق صدر امریکہ بارک اوباما کہتا ہے: ’’گھر بنالو' ایک مضبوط گھر ایک مضبوط معاشرے کی ضرورت ہے۔‘‘ سابق صدر امریکہ جارج بُش کے الفاظ ہیں: ’’خدا کے واسطے شادیاں کرلو‘‘۔ سابق صدر یو ایس ایس آر گورباچوف کہتا ہے: ’’اب ہمیں عورتوں کو گھروں میں لانے کے لیے تحریک چلانی چاہیے۔‘‘ اِنہی حالات کی پیشین گوئی کرتے ہوئے ملّتِ اسلامیہ کے حُدی خواں نے اہلِ مغرب کو یوں مخاطب کیا تھا: ؎

دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو' وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

## دردِ دل

اسلام میں حیا کا مقام ومرتبہ بھی ہمارے سامنے آگیا اور بے حیائی کی شناعت وخباثت بھی واضح ہوگئی۔ حیا و بے حیائی کا ہمہ جہتی تقابل بھی سامنے آیا اور ان دونوں کی بنیاد پر اُٹھنے والے معاشروں کا نقشہ بھی ہمارے سامنے واضح ہوا۔ اب دینی حمیت وغیرت اور عقل وفہم کا تقاضا تو یہ تھا کہ جہاں ہم خود کو انفرادی واجتماعی سطح پر حیا میں مُلبّس کرلیں' وہیں بے حیائی کی کسی بھی صورت کو اپنے پاس پھٹکنے بھی نہ دیں۔ مگر افسوس صد افسوس! ایسا نہ ہوسکا۔ مغرب کی چکاچوند اور آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی سائنسی وفکری ترقی کے سامنے تمام تہذیبیں وروایتی اقدار گھٹنے ٹیکتی چلی گئیں۔ بقول علامہ اقبالؒ: ؎

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے



یہاں تک کہ اسلامی تہذیب کے عَلَم بردار بھی بالکلیہ اس دجالی و بے خدا تہذیب کے مضر اثرات سے خود کو محفوظ نہ رکھ سکے' الا ماشاء اللہ! واقعہ یہ ہے کہ ایک محکوم وغلام ذہن اپنے طرزِ فکر و عمل میں اسی انداز کو اپناتا ہے جو حاکم قوم کا ہوتا ہے۔ اسی حقیقت کو بانی تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحبؒ اپنی معرکۃ الآراء تصنیف ’’اسلام کی نشاۃِ ثانیہ: کرنے کا اصل کام‘‘ میں ’’فکرِ مغرب کا ہمہ گیر استیلاء‘‘ کے عنوان کے تحت یوں بیان کرتے ہیں:

> ’’موجودہ دور بجا طور پر مغربی فلسفہ وفکر اور علوم وفنون کی بالادستی کا دور ہے اور آج پورے کُرۂ ارضی پر مغربی افکار ونظریات اور انسان اور کائنات کے بارے میں وہ تصورات پوری طرح چھائے ہوئے ہیں جن کی ابتدا آج سے تقریباً دو سو سال قبل یورپ میں ہوئی تھی اور جو اس کے بعد مسلسل مستحکم ہوتے اور پروان چڑھتے چلے گئے۔ آج کی دنیا سیاسی اعتبار سے خواہ کتنے ہی حصوں میں منقسم ہو' تقریباً ایک ہی طرزِ فکر اور نقطۂ نظر پوری دنیا پر حکمران ہے اور بعض سطحی اور غیر اہم اختلافات سے قطع نظر ایک ہی تہذیب اور ایک ہی تمدن کا سکّہ پوری دنیا میں رواں ہے۔ کہیں کہیں منتشر طور پر کوئی دوسرا نقطۂ نظر اور طرزِ فکر اگر پایا بھی جاتا ہے تو اس کی حیثیت زندگی کی اصل شاہراہ سے ہٹی ہوئی پگڈنڈی سے زیادہ نہیں ہے' ورنہ مشرق ہو یا مغرب ہر جگہ جو طبقے قیادت و سیادت کے مالک ہیں اور جن کے ہاتھوں میں اجتماعی زندگی اور اس کے جملہ متضمنات کی اصل زمامِ کار ہے وہ سب کے سب بلا استثناء ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ مغربی تہذیب وتمدن اور فلسفہ وفکر کا یہ تسلط اس قدر شدید اور ہمہ گیر ہے کہ بعض اُن قوتوں کے نقطۂ نظر کا جائزہ بھی اگر دقتِ نظر سے لیا جائے' جو مختلف ممالک میں مغربی تہذیب وتمدن کے خلاف صف آرا ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی مغرب کے اثرات سے بالکلیہ محفوظ نہیں ہیں اور خود ان کا طرزِ فکر بہت حد تک مغربی ہے۔‘‘

شیطان نے اپنا پہلا وار انسانوں کے والدین حضرتِ آدم وحوا (علیہما السلام) پر کیا' جس کے نتیجے میں انہوں نے سہواً جنت کے شجر ممنوعہ کا پھل کھا لیا اور ان کے ستر اُن پر عیاں ہوگئے۔ چنانچہ فطرتِ انسانی میں ودیعت شدہ شرم وحیا کا مادہ غالب آیا اور انہوں نے جنت کے پتوں سے ستر پوشی کی۔ قرآنِ حکیم میں سات مرتبہ دہرائے جانے والے اس قصہ آدم وابلیس سے ایک سبق یہ بھی ملتا ہے کہ شرم وحیا کا مادہ انسانی فطرت میں مضمر ہے اور یہ کہ شیطان کا اوّلین ومؤثر ترین وار اسی حیا کو زائل کرنا ہے۔

شیطان اپنا یہ وار کامیابی سے کھیلتے ہوئے مغرب میں ایک بے حیا معاشرہ تشکیل دے چکا ہے‘ مگر تشویش ناک صورتِ حال یہ ہے کہ وہی بے راہ روی مسلمانوں کے معاشرے میں بھی عام ہوتی جارہی ہے کہ جس کا تصوّر کچھ عرصہ قبل تک محال تھا۔ بالخصوص نوجوان نسل پر اس شیطانی حملے کا وار سب سے شدید ہے۔ خوش نما ناموں کے ذریعے بے حیائی کو بطورِ فن متعارف کروایا جارہا ہے۔ تعلیمی اداروں کا تو کیا ہی پوچھنا کہ وہاں مغربی افکار واطوار کی ہو بہو نقل کی جاتی ہے اور جو اشاعتِ فواحش کا گڑھ بن کر گویا بے خدا و بے حیا مغربی تہذیب کی توسیع کے متولی ہونے کا کردار ادا کر رہے ہیں۔ ان کا ماحول (مغربی یونیورسٹیوں اور معاشروں کا حق الیقین کی سطح پر مشاہدہ کرنے والے) علامہ اقبالؒ کے ان اشعار کا کامل نمونہ پیش کرتا ہے: ؎

وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود
یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود

یوں تو یہ نقشہ بالعموم ہمارے پورے معاشرے کا ہی ہوتا جارہا ہے مگر بالخصوص اس شیطانی تہذیب کا مبدأ ومرکز ہمارے تعلیمی ادارے بن رہے ہیں۔ ستم بالائے ستم‘ بنی نوعِ آدم کو حیا کے زیور سے عاری کرنے میں سوشل میڈیا اپنا بھرپور کردار ادا کر رہا ہے۔ دنیا بھر کا گند موبائل نامی چھوٹی سی ڈبیا میں جمع کر کے اور گویا ’’دریا کوزے میں بند کر کے‘‘ بے حیائی کے تمام مواقع‘ زمان ومکان کی قید سے آزاد کر کے دستیاب کر دیے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں‘ کالی سکرینوں نے بے حیائی کی انتہائی صورت کو بھی entertainment کے نام پر اور کثرتِ ورود کے ذریعہ یوں نارملائز (normalize) کر دیا ہے کہ اب وہ بے حیائی بے حیائی لگتی ہی نہیں‘ اب وہ بدنظری بدنظری رہی ہی نہیں‘ بدسمعی گناہ محسوس ہی نہیں ہوتی۔ کالی سکرینوں کا کالا جادو یہ بھی ہے کہ پہلے خلوتیں آلودہ ہوئیں‘ اب جلوتیں بھی داغدار ہو رہی ہیں۔ یوں تو اس کا اوّلین شکار نوجوان نسل ہے مگر اس کے ’’متاثرین‘‘ کی فہرست میں شمولیت کے لیے جنس وعمر کی کوئی قید نہیں ہے۔ ہر عمر‘ ہر شعبے سے متعلق افراد‘ مختلف مذاق ومزاج رکھنے والے لوگوں کے لیے ان کی پسند کا سامانِ لہو ولعب ہمہ وقت موجود ہے۔ عوام کا تو حال چھوڑیے‘ اچھے بھلے دین دار لوگ بھی اس اُفتاد سے خود کو محفوظ نہ رکھ سکے۔ کاش کہ کوئی انہیں بتائے کہ جس طرح نامحرم کو حقیقت میں دیکھنا اور بلاضرورت سننا منع ہے‘ بالکل اسی طرح سکرین پر بھی دیکھنے/ سننے کی ممانعت ہے۔ ؎



وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

عشق یا محبت ایک مقدس/ پاکیزہ جذبہ ہے بشرطیکہ وہ حقیقی ہو۔ مخلوق کا مخلوق سے تعلقِ عشق چاہے کتنا ہی گہرا کیوں نہ ہو‘ بہرحال مجازی ہے۔ چونکہ مخلوق کا مربّی ومحسن ومنعمِ حقیقی فقط اُن کا خالق ذوالجلال ہے لہٰذا عشقِ حقیقی بھی بجز اُس ذات کے کسی سے ممکن نہیں اور ’’معشوقِ حقیقی‘‘ اگر کوئی ہوسکتا ہے تو وہ اللہ عزّ وجل ہے۔ اس حصولِ عشقِ حقیقی کا تقاضا اللہ کا اپنے ہر بندۂ مؤمن سے ہے اور یہی صفت اہلِ ایمان کی قرآن مجید میں بھی بیان ہوئی:

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ﴾ (البقرۃ:۱۶۵)

’’اور جو ایمان لائے ہیں وہ سب سے زیادہ اللہ سے محبت کرتے ہیں۔‘‘

اور

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ .....﴾ (المائدۃ:۵۴)

’’اے ایمان والو! جو شخص تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے تو اللہ (کو کوئی پروانہیں وہ) عنقریب (تمہیں ہٹا کر) ایک ایسی قوم کو لے آئے گا کہ اللہ اُن سے محبت کرے گا اور وہ اُس سے محبت کریں گے .....‘‘

مغرب کی اندھی تقلید میں پاکستان کے مسلمان معاشرے میں بعض عناصر خالق ومخلوق کے باہمی تعلق محبت کے اس پاکیزہ جذبے کو ’’ویلنٹائن ڈے (۱۴ فروری)‘‘ کے نام پر ہائی جیک کرنے کی مذموم کوشش کرتے ہیں۔ مزید برآں ’’عورت مارچ‘‘ کے نام پر ہر سال وہی حقوق وآزادیٔ نسواں کے کھوکھلے مغربی نعروں کی قولاً وعملاً تجدید کی جاتی ہے۔ اسی معاشرے سے نکلنے والی ہماری ہی مائیں بہنیں انتہائی فحش سلوگنز (جن کو اس وقت ہم نوکِ قلم پر بھی نہیں لاسکتے) پر مبنی پلے کارڈز تھامے مارچ کر کے حیا کا جنازہ نکال رہی ہوتی ہیں۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون! اسی طرح اسلام آباد کے نور مقدم کیس پر بھی ذرا نظر ڈال لیں۔ یہ کیس اسی مغربی کلچر ’’We are living together but we are not married‘‘ ہی کا ایک نقشہ تھا جو مملکتِ خداداد پاکستان کی سرزمین پر رونما ہوا۔ فیشن شوز‘ کیٹ واکس‘ بوتیک‘ ڈانس پارٹیز‘ میوزیکل کنسرٹس وغیرہ کی sugar coated terms بھی اسی بے حیائی کے شجرۂ

خبیثہ کی وہ مکروہ شاخیں ہیں جو نہایت تیزی کے ساتھ اور ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اسلامی جمہوریہ پاکستان (so called) میں اپنے پنجے گاڑ رہی ہیں۔ ماضی قریب میں اس کی تازہ ترین مثال ہے ٹرانس جینڈر ایکٹ کا پاس ہو جانا۔

یہ سب اقدامات ہیں اس مغربی و شیطانی ایجنڈے کے ضمن میں کہ جس کا مقصد حیا کے زیور کو ہمارے اندر سے کھرچ کر پھینکنا ہے‘ اور اس ایجنڈے کی تکمیل میں انجانے یا جانتے بوجھتے اوّلین مدد و معاون بن رہے ہیں مغرب سے انتہائی مرعوب ہمارے وہ مقتدر طبقات و کاروباری افراد و دانشور حضرات کہ جن کے ہاتھوں میں سیاسی و معاشی و سماجی سطح پر معاشرے کی اصل زمامِ کار ہے۔ عام عوام کا حال بھی کچھ مختلف نہیں‘ ذرا کسی کے پاس چار پیسے جمع ہو جاتے ہیں اور وہ کسی غریب علاقے سے پوش علاقے منتقل ہو جاتا ہے تو وہ پہلا کام یہ کرتا ہے کہ اپنے گھر سے پردہ کو نکال کر پھینکتا ہے کہ جناب اب تو ہم ’’ماڈرن‘‘ ہو گئے ہیں اور یہ کہ پردہ تو غریبوں اور دقیانوس قسم کے لوگوں کا کام ہے‘ اب کیا چودہ سو سال پرانے اصول ہمارے ہاں نافذ ہوں گے؟ العیاذ باللہ! ہمارا بے پردہ ہونا بھارت اور دیگر انتہا پسند مغربی ممالک کی بہادر باپردہ مسلم خواتین کو منہ چڑھانے کے مترادف ہے کہ ہم تو تمہارا نقاب اُتارنے والوں کے کیمپ میں ہیں۔ الیکٹرانک و سوشل میڈیا پر بیٹھے چند نام نہاد دانشور یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ جناب اصل پردہ تو دل کا پردہ ہوتا ہے‘ اصل حیا تو دل کی حیا ہوتی ہے‘ اگر دیدہ و دل میں حیا نہ ہو تو چاہے آپ کسی کو کمبل بھی پہنا دیں تو کوئی فائدہ نہیں ہوگا‘ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ ان ظالموں کو کوئی یہ تو بتائے کہ کہنے سے پہلے اتنا تو سوچ لیا کرو کہ تمہارے الفاظ کی زد کہاں تک جائے گی۔ نعوذ باللہ‘ ثم نعوذ باللہ!! کیا اُمہات المؤمنین کی آنکھوں میں حیا نہ تھی؟ کیا بناتِ رسول ﷺ کے قلوب باحیا نہ تھے؟ انہوں نے تو پردہ کیا‘ بلکہ ان نفوسِ مقدسہ سے بھی پردہ کیا جو نبی اکرم ﷺ کے صحبت و تربیت یافتہ تھے۔ درحقیقت یہ سارے ہتھکنڈے ہماری روایات‘ تمدن و ثقافت سے حیا کے عنصر کو خارج کرنے کے مختلف طریقے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سازشوں سے ہماری‘ ہمارے گھرانوں اور تمام ہی مسلم معاشروں کی حفاظت فرمائے اور ہمیں حیا کے زیور سے خود کو آراستہ و پیراستہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے‘ کیونکہ وہی مرد معاشرے میں سر اٹھا کر چلتے ہیں جن کی مائیں بہنیں نظریں جھکا کر چلتی ہیں۔ اللہ ہمیں عقل و شعور عطا فرمائے۔ ع دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا! ❀

# منظّم مسلّح جِدّ و جُہد

## تاریخ اسلامی کا اِک درخشاں باب

حذیفہ محمود

۱۷ رمضان کی تیز دھوپ والی دو پہر ہے۔ پہاڑوں اور مٹی کے ٹیلوں کے درمیان واقع بدر کا میدان آج کارزار کا منظر پیش کر رہا ہے۔ دونوں جانب جوش وجذبہ اپنے عروج پر ہے۔ ایک طرف مکہ کے سردار گھوڑوں پر سوار کیل کانٹے سے لیس ہو کر اللہ کے چراغ کو بجھانے کا عزم کیے ہوئے ہیں۔ وہ گویا مدینہ اور اہلِ مدینہ کو نیست و نابود ہوتا ہوا دیکھ رہے ہیں۔ دوسری جانب بے سروسامانی کا یہ عالم ہے کہ بیشتر نوجوان تلواروں اور سواریوں سے ہی محروم ہیں۔ مدمقابل مکہ کے سورما ان سے تعداد میں تین گنا ہیں۔ ۳۱۳ کا لشکر ایک ہزار مسلّح باطل پرستوں سے نبرد آزما ہے۔ پورے لشکر کے پاس دو یا تین گھوڑے اور ۷۰ اونٹ ہی میسر ہیں۔ دوسری طرف نہ صرف مرد جنگجو تھے بلکہ ان کی خواتین بھی رجزیہ اشعار پڑھ کر آگ کے ایندھن کا کام کر رہی تھیں۔ شراب و کباب کے جام و دستر تیار کیے جا رہے تھے۔ اِس جانب رسول اللہ ﷺ سربسجود ہیں اور مسلمانوں کے لیے ربّ ذوالجلال کی نصرت طلب کر رہے ہیں۔ بالآخر سفید پوشوں کے قدسی قافلے کا نزول ہوا اور کفار کی صفوں کی صفیں اُلٹتی گئیں۔ مکہ کے ۷۰ سردار مسلمانوں کی تلواروں کی زد میں آ کر جہنم میں تہ بہ تہ ڈھیر ہوئے پڑے تھے۔ معرکۂ حق و باطل میں حق کی تلوار فاتح قرار پائی تھی، جس کا منہ بولتا ثبوت بدر میں پڑی کفار کی دم بریدہ لاشیں تھیں!

منظر تبدیل ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا وصال ہو جاتا ہے۔ مسلمانانِ مِلّتِ مکہ و مدینہ کی مقدس سرزمین کو چھوڑ کر نورِ توحید کے اتمام کے لیے تیر و تلوار لے کر دشوار گزار وادیوں اور سنگلاخ پہاڑوں کا رخ کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ خلافتِ فاروقؓ کی ایک چڑھتی ہوئی دوپہر تھی۔ شام کا علاقہ ''یرموک'' حق و باطل کا میدان بنا ہوا تھا۔ میدان میں موجود رومیوں کے افراد



۶۰ ہزار تھے۔ ان کے دیو قامت گھوڑے اور ہاتھی میدان میں بلا کا منظر پیش کر رہے تھے۔ ان کے عقب میں دونوں جانب نہر یرموک بہتی تھی اور درمیان میں ان کی فوج در موج موجود تھی۔ مسلمان مجاہدین بھی جذبۂ ایمانی سے سرشار تھے۔ اگرچہ ان کی تعداد مخالفین سے کئی گنا کم تھی مگر جذبہ ایسا کہ پہاڑوں کے جگر چیر دے۔ امیر لشکر حضرت ابوعبیدہ بن الجراح ؓ ابھی فوج کو ترتیب ہی دے رہے تھے کہ اللہ کی تلوار حرکت میں آئی اور خالد بن ولید ؓ پکار لگاتے ہوئے صفوں سے آگے آئے کہ ''اے مسلمانو! ٹھہر جاؤ! آج میں اس رومی لشکر کو خاک آلودہ کر دوں گا۔ مجھے بس تیس افراد دے دیے جائیں۔'' تصور کریں! تیس افراد کو ساتھ لے کر وہ ساٹھ ہزار کے لشکر جرار کو تہ تیغ کرنے کا عزم کر رہے ہیں! حضرت ابوعبیدہؓ نے بہت ٹالنے کی کوشش کی مگر ان کے بے حد اصرار پر ۶۰ افراد دے کر مقابلے کے لیے روانہ کر دیا۔ یوں چشم فلک نے وہ منظر بھی دیکھا کہ جب ۶۰ افراد کا قلیل لشکر خود سے ایک ہزار گنا بھاری بھرکم لشکر سے جا ٹکرایا۔ رومیوں نے پہلے تو اس چھوٹے سے لشکر کو ''صلح کا دستہ'' سمجھ کر خوب جشن منایا، مگر اس وقت ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب انہیں معلوم ہوا کہ یہ ۶۰ لوگ ہم سے موت کا کھیل کھیلنے آ رہے ہیں۔ حضرت خالد بن ولیدؓ اپنے لشکر کو چھ چھ افراد کی ۱۰ ٹولیوں میں تقسیم کر کے رومی لشکر پر مسلسل حملے کرنے لگے تھے۔ کل بیس حملے کیے گئے اور بالآخر یہ ساٹھ افراد کفار کی صفوں کو چیرتے ہوئے لشکر کے دامن میں جا کر اپنی تلواروں سے کفار کے سروں کا مینار کھڑا کرنے لگے۔ طلوعِ آفتاب سے زوال ہوا، زوال سے سفر غروب کی جانب بڑھ رہا تھا مگر یہ گھمسان کی جنگ بدستور جاری تھی۔ ہر گزرتے وقت کے ساتھ بقیہ اسلامی لشکر کی بے چینی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اب اپنے بھائیوں کے فراق کا غم منانے لگے تھے اور ذہنی طور پر خود کو اس کے لیے تیار کرنے لگے تھے۔ بالآخر امیر لشکر نے بقیہ لشکر کو حملہ کرنے کا حکم دیا ہی تھا کہ کیا دیکھتے ہیں، پورا کفر کا لشکر اُلٹے پاؤں بھاگ کھڑا ہوا ہے۔ نہ جائے ماندن، نہ پائے رفتن! پورا رومی لشکر دریا میں چھلانگ لگا کر جان بچانے کی ناکام کوشش کر رہا ہے۔ ان لوگوں کو جو پہلے اسلامی لشکر کی قلیل تعداد کا مذاق اڑا رہے تھے، ۶۰ مسلمانوں نے ہی انہیں ناک چنے چبوا دیے تھے۔ چنانچہ اب وہ اپنا رخ مغرب کی جانب کیے دوڑ لگا رہے تھے جبکہ اللہ کی فوج کے چند افراد قہرِ الٰہی بن کر ان کا پیچھا کر رہے تھے۔ ذرا تصوّر تو کریں، چشمِ فلک نے کیسا منظر دیکھا ہوگا کہ ۶۰ ہزار افراد کا لشکر

بھاگ کر جان بچانے کی تگ ودو کر رہا ہے جبکہ صرف ۶۰ افراد ان کا پیچھا کیے ہوئے ہیں۔ جنگ یرموک میں مسلمانوں کو فیصلہ کن فتح حاصل ہوئی۔ اس معرکے میں ۱۰ مسلمان شہید ہوئے‘ جبکہ رومیوں کے پانچ ہزار افراد قتل ہوئے۔

یہ تھی محمد رسول اللہ ﷺ کی تیار کردہ وہ فوج جس نے آپ ﷺ کے جانے کے بعد بھی کبھی اسلام سے منہ نہیں موڑا بلکہ دین کی دعوت لے کر تمام اقوامِ عالم سے جا بھڑی۔ خدائی فوج کے یہ نوجوان دشت وصحرا میں سے کچھ نہ چھوڑتے۔ سمندر بھی ان کی راہ میں حائل نہ ہو پاتا۔ یہ اپنے گھوڑے سمندر میں ڈال دیا کرتے تھے۔

دشت تو دشت ہیں‘ دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحرِ ظلمات میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے!

عرب سے جاری ہونے والا یہ سیلِ رواں اب ہندوستان‘ افریقہ کے علاوہ یورپ کے قلب میں واقع ہسپانیہ تک پھیل چکا تھا۔ مسلم قوم کے نوجوان اپنی صلاحیتیں اسی میدان میں صَرف کر رہے تھے۔ ان کا مال اور ان کی اولاد اسلام کی نشرواشاعت کے لیے وقف تھیں۔ وہ سال کے تمام موسموں میں تلوار اٹھائے ہوئے کفار سے جان لڑاتے تھے۔ قیصر وکسریٰ کے تخت وتاج اب ان کے زیرنگیں ہو چکے تھے۔

پھر گزرتے وقت کے ساتھ پیچھے کی طرف جانے کا سفر کچھ اس تیزی سے طے ہوا کہ اب ہمیں ان باتوں پر ’’کچھ کچھ ہی یقین سا‘‘ ہوتا ہے۔ اسلحے کی گفتار اور گھوڑے کی رفتار اب ہم بھول گئے ہیں۔ اغیار نے ہمارے بچوں اور بڑوں میں اسلحے کا ایسا خوف بٹھا دیا ہے کہ اب ہمیں چھری دیکھ کر بھی نیند نہیں آتی! بقولِ اقبال ؎

کبھی اے نوجواں مسلم! تدبر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اِک ٹوٹا ہوا تارا
تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوشِ محبت میں
کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاجِ سرِ دارا

دوسری طرف آج مغربی اقوام کا حال یہ ہے کہ ان کے ہاں اسلحہ رکھنا اہم ضروریاتِ زندگی میں شامل ہے۔ وہ اپنے بچوں کو نہ صرف اس کی ترغیب دیتے ہیں بلکہ اسلحہ کی باقاعدہ عملی



مشق ان کے سکولوں میں داخلِ نصاب ہے۔ وہاں اس سے امن کو کوئی خطرہ نہیں ہے‘ بلکہ ان کے بقول یہ تو امن کے لیے ناگزیر ہے۔ البتہ کسی اسلامی ملک میں اسلحے کا وجود امنِ عالم کے لیے خطرہ ہے! لائسنس کی موجودگی میں بھی اسلحہ یہاں غیر محفوظ گردانا جاتا ہے۔ مغرب کی اپنی حالت بڑھتے ہوئے اسلاموفوبیا کی وجہ سے کچھ یوں ہے کہ آئے روز کوئی سرپھرا کھڑا ہوتا ہے اور بے ضرر مسلم باشندوں کو اپنی اسلام دشمنی کا نشانہ بناتا ہے۔ چنانچہ کبھی تو وہ مسجد میں داخل ہو جاتا ہے اور کبھی کسی سکولوں میں داخل ہو کر مسلمان بچوں کو جان سے مار ڈالتا ہے۔ پھر انسانی حقوق کی یہی نام نہاد علمبردار مغربی ریاستیں اگلے روز اسے نفسیاتی اور پاگل قرار دلواتی ہیں اور یہ جا‘ وہ جا۔ بات آئی گئی ہو جاتی ہے اور معاملہ رفع دفع!

اسلحہ ان کے محفوظ نہیں‘ جان ہماری غیر محفوظ ہے! یہ کفار خود تو اسلحہ استعمال بھی کرتے ہیں اور فروخت بھی‘ لیکن اگر کوئی اسلامی ملک آگے بڑھ کر اسلحہ بنانے کا اعلان کرے تو وہ ’’دہشت گرد‘‘ قرار دیا جاتا ہے اور امنِ عالم کے لیے اسے خطرے کی علامت ٹھہرایا جاتا ہے۔ چنانچہ نتیجہ ہمارے سامنے ہے کہ نہایت متمول ودولت مند مسلم ممالک بھی نہتے اور غیر مسلح ہیں۔ ان کے تیل کی دھار سے تو ساری دنیا فائدہ اٹھاتی ہے مگر خون کی دھار ان کے بس میں کہاں! لہٰذا نہ تو ان کی بات میں وزن ہوتا ہے اور نہ ہی ان کے موقف کی شنوائی۔ چنانچہ وہ اب اپنے فلسطینی بھائیوں سے نظریں چرا رہے ہیں‘ عالمی طاقتوں کے سامنے کیا بات رکھیں گے؟ یہ خالی خولی دھمکیاں ہی ہوں گی‘ ان کے پیچھے کیل کانٹے جو نہیں! مغرب کو معلوم ہے کہ یہ اسلحہ بھی تو ہم ہی سے خریدتے ہیں۔ سو ان کو عیاشیوں میں لگائے رکھو۔ اگر ان کو لڑنا بھی ہے تو آپس ہی میں لڑیں۔ چنانچہ یہ دونوں جانب کے مسلم ممالک کو بھاری رقوم میں اسلحہ فراہم کرتے ہیں اور پھر یہی دونوں مسلم ممالک ایک دوسرے کو آنکھیں دکھا رہے ہوتے ہیں!

قرآن حکیم اور سیرتِ نبویہ سے ہمیں دشمن کے مقابلے میں مکمل عسکری تیاری اور بھرپور مسلح ہونے کی تعلیمات ملتی ہیں۔ حضور ﷺ نے کبھی زکوٰۃ ادا نہیں کی کیونکہ کبھی اتنا مال ہی جمع نہیں ہوا کہ اس کی نوبت آئے! حضرت عائشہ صِدّیقہ ؓ فرماتی ہیں کہ ہمارا چولہا دو دو ماہ تک خشک رہتا تھا حتیٰ کہ وہاں گھاس اُگ آتی تھی۔ دوسری طرف جب حضور ﷺ کا وصال ہوا تو آپ ﷺ کی ملکیت میں نو(۹) تلواریں‘ دو(۲) خنجر‘ چھ(۶) کمانیں اور سات(۷) زرہیں

موجود تھیں‘ جن میں سے ایک زرہ کسی یہودی کے پاس گروی رکھوا کر چند صاع گندم ادھار لی گئی تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلم قوم کی پہلی ترجیح اپنے دفاع واقدام کے لیے بھرپور مسلح ہونا ہے‘ چاہے اس کے لیے آسائشِ زندگی بلکہ ضروریاتِ زندگی سے ہی کیوں نہ سمجھوتا کرنا پڑے! اُمّتِ مُسلمہ کی موجودہ حالتِ زار کی ایک بڑی وجہ جنگی میدانوں سے پیچھے ہٹنا اور اسلحہ سازی سے فرار بھی ہے! اس وقت ۵۷ اسلامی ممالک میں سے صرف ایک ہی ملک ایٹمی طاقت سے لیس ہے مگر اس کی معاشی کمزوری اس کی جرأت وعزیمت کی راہ میں حائل ہو جاتی ہے۔ لہٰذا ہمیں ریاستی سطح پر پھر اسلحہ سے شناسائی پیدا کرنی ہوگی‘ کیونکہ پُرامن منظم مسلح اقوام ہی اپنے دفاع کا حق اور بھرپور صلاحیت رکھتی ہیں۔ اس ضمن میں تیراندازی‘ گھڑسواری اور جدید اسلحہ کی باقاعدہ مشق بھی حکومتی اور ریاستی سطح پر منعقد کی جانی چاہیے‘ کیونکہ یہ رحمۃ للعالمین ﷺ کا ہمیں حکم بھی ہے اور موجودہ دور کا اولین تقاضا بھی! تبھی تو دنیا ایک بار پھر وہ وقت دیکھے گی جب ہمارے ساٹھ بھی ان کے ساٹھ ہزار پر بھاری ہوں گے‘ ان شاء اللہ تعالیٰ! ❁❁❁


داعیٔ قرآن ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی فکرانگیز تالیفات

سیرت النبی ﷺ کی روشنی میں اسلامی انقلاب
کے مراحل ومدارج اور لوازم

منہجِ انقلابِ نبوی ﷺ

مجلد 750 روپے، غیر مجلد 500 روپے

سیرتِ مطہرہ کے دل پذیر موضوع پر ڈاکٹر صاحب
کی زندگی کے آخری خطابات کا مجموعہ

سیرتِ خیرُ الانام علیہ الصلوٰۃ والسلام

صفحات 240، قیمت 550 روپے

# ذِلّت ورسوائی کا سبب: ترکِ قرآن

حافظ محمد اسد☆

جب قومیں پستی میں گرتی ہیں تو ان کی کیفیت پہاڑ کی بلندی سے لڑھکنے والی اشیاء سے زیادہ نہیں ہوتی۔ وہ گرتی چلی جاتی ہیں۔ زمین و آسمان انہیں اُلٹ پلٹ ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی حرکت قابو میں نہیں رہتی الاّ یہ کہ کسی مضبوط سہارے (عُروۃ الوثقی) ہی کو تھام کر خود کو بچائیں۔ مسلم قوم کی موجودہ کیفیت اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ اُمّتِ مُسلمہ پستی اور ذلت کے عمیق کنویں میں گرتی چلی جا رہی ہے اور کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس تنزلی اور خواری کی وجہ کیا ہے! اس اندھیرے کنویں سے نجات کیسے ملے گی؟ وقتاً فوقتاً کچھ دردمندانِ قوم اُٹھتے ہیں اور اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق علاج تجویز کرتے ہیں، لیکن صورتِ حال یہ ہے کہ ع: مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی!

آج سے تقریباً ایک صدی پہلے مسلم قوم کی اس پستی اور ذلت کا سبب شاعرِ مشرق علامہ اقبال نے کچھ یوں بتایا تھا: ؎

وہ زمانے میں معزّز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر!

اگر ہم غور کریں کہ آج ہم ثریا سے تحت الثریٰ میں کیوں پہنچ گئے تو اس کا جواب ہمیں اس حدیث مبارکہ میں ملتا ہے۔ حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((يُوْشِكُ الْأُمَمُ أَنْ تَدَاعٰى عَلَيْكُمْ كَمَا تَدَاعَى الْأَكَلَةُ إِلٰى قَصْعَتِهَا)) فَقَالَ قَائِلٌ: مِنْ قِلَّةٍ نَحْنُ يَوْمَئِذٍ؟ قَالَ: ((بَلْ أَنْتُمْ يَوْمَئِذٍ كَثِيْرٌ وَلٰكِنَّكُمْ غُثَاءٌ كَغُثَاءِ السَّيْلِ، وَلَيَنْزِعَنَّ اللّٰهُ مِنْ صُدُوْرِ عَدُوِّكُمُ الْمَهَابَةَ مِنْكُمْ،

☆ استاذ قرآن اکیڈمی یٰسین آباد کراچی



وَلَيَقْذِفَنَّ فِيْ قُلُوْبِكُمُ الْوَهْنَ)) قِيْلَ: وَمَا الْوَهْنُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ: ((حُبُّ الدُّنْيَا وَكَرَاهِيَةُ الْمَوْتِ))

[سنن ابی داوٗد، بحوالہ مشکاۃ المصابیح ح:۵۳۶۹]

"قریب ہے کہ اقوامِ عالم ایک دوسرے کو تم پر ٹوٹ پڑنے کی دعوت دیں گی جیسا کہ کھانا کھانے والے ایک دوسرے کو اپنے دسترخوان کی طرف بلاتے ہیں۔" اس پر کسی نے کہا: "کیا اُس روز ہم تعداد میں کم ہوں گے؟" آپؐ نے فرمایا: "تعداد میں تو اُس روز تم بہت زیادہ ہو گے، لیکن تمہاری حیثیت جھاگ سے زیادہ نہ ہو گی جیسا کہ سیلاب کا جھاگ ہوتا ہے، اور اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کے دلوں سے تمہاری ہیبت نکال باہر کرے گا اور خود تمہارے دلوں میں وہن (کی بیماری) ڈال دے گا۔" پوچھا گیا: اے اللہ کے رسول (ﷺ)! وہن کیا چیز ہے؟ آپؐ نے فرمایا: "دنیا کی محبت اور موت سے نفرت!"

آج ہمارے قلوب دنیا کی محبت، اس کی رنگینیوں سے الفت، اس کے اسبابِ تعیش کے خوگر، موت سے متوحش، خوفِ الٰہی سے خالی اور ایمانی حرارت، اسلامی جرأت و بے باکی سے محروم ہو گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری اتنی بڑی تعداد بھی سمندر کے جھاگ کی مانند ہو گئی۔ اس صورتِ حال میں کیا اس مرض کا کوئی علاج ممکن ہے؟ کیا اُمید کی کوئی کرن نظر آتی ہے؟

## مرض کا علاج

علامہ اقبال نے اس کا علاج بھی کچھ اس انداز میں مسلم قوم کو بتایا ہے کہ: ؎

وہی دیرینہ بیماری، وہی نامحکمی دل کی
علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی!

یعنی آج سے تقریباً ساڑھے چودہ صدیاں قبل (اسلام کی آمد سے قبل) ایک بیماری نے انسانوں کے دلوں کو زنگ آلود کر دیا تھا۔ اصل توحید کا نظریہ بالکل ماند پڑ چکا تھا۔ ایمان بالآخرت سے لوگ بے بہرہ ہو چکے تھے۔ مالی منفعت، لوٹ کھسوٹ، اقتدار کی ہوس اور دوسری اقوام کو زیر کرنے کا جذبہ کفر کی اجتماعی سوچ کا محور تھا۔ آج پھر تقریباً وہی صورت حال لوٹ کر آ گئی ہے۔ مسلمانوں کی حیثیت بھی تقریباً یہی ہے۔ عقیدۂ آخرت زبان پر تو ہے لیکن دل اس سے تقریباً بے بہرہ ہیں۔ اگر اللہ کے سامنے اعمال کی جواب دہی کا تصور ذہن میں مستحضر ہو تو ساری برائیاں ختم ہو سکتی ہیں۔ اس لیے علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ ذہنوں پر اسی بیماری (شرک، بدعملی

اور دیگر تاریکیوں) کے غلبے نے دلوں کو سیاہ کر رکھا ہے۔ ان ساری بداعمالیوں کا علاج اسی ’’آبِ نشاط انگیز‘‘ سے ممکن ہے اور وہ ہے ’’قرآن کریم‘‘۔ قرآن کریم نے انسانوں کو جو ضابطہ حیات (الدین) عطا کیا ہے اُس کو ’’اسلام‘‘ کہہ کر پکارا ہے۔ مسلم قوم کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ ’’اسلام‘‘ کی پیروکار ہے۔ کیا اس کا یہ دعویٰ واقعی درست ہے؟ اُن کے ’’اعمال وعقائد‘‘ اس دین کے تقاضوں کے برخلاف تو نہیں ہیں!

## تاریخِ اسلام یا تاریخِ مسلم؟

اسلام کی تاریخ رقم کرتے ہوئے مؤرخین نے ایک غلطی یہ کی ہے کہ انہوں نے اسلام کی تاریخ اور مسلم قوم کی تاریخ کو ایک ہی شے سمجھ لیا۔ اس غلطی کی وجہ سے مسلم قوم کے عروج وزوال کو اصطلاحی طور پر ’’اسلام کا عروج وزوال‘‘ سمجھا اور سمجھایا گیا‘ جس نے بہت سی دیگر غلط فہمیوں کو بھی جنم دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کو تو زوال ہو ہی نہیں سکتا‘ کیونکہ یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا عطا کردہ ناقابلِ تبدیل نظامِ حیات ہے۔ جب سے کُرۂ ارض پر بنی نوعِ آدم نے شعور سنبھالا ہے‘ اسی نظریۂ حیات کو اپنانے والوں نے دُنیا میں سرفرازیاں اور کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ اس نظریۂ حیات میں ترقی بھی ہے۔ اس کے سوا کوئی اور فلسفۂ زندگی انسان کو وہ روشنی عطا کر ہی نہیں سکتا جس میں وہ اپنے سامنے کا راستہ روشن دیکھ سکے اور بے خوف وخطر آگے ہی آگے بڑھتا چلا جائے۔ افسوس کہ ’’مسلم قوم‘‘ کا نام مؤرخین نے اس قوم کو دے دیا جنہوں نے ایسے خاص معاشرے میں جنم لیا‘ جہاں چند مخصوص ’’عقائد ورسومات‘‘ کو تقدس کا جامہ پہنا کر اُن پر عمل کرنے والوں کو عزت واحترام کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔ یہ صورتِ حال دُنیا کے دیگر مذاہب میں بھی پائی جاتی ہے۔ اِس طرح اسلام بھی محض ایک مذہب بن کر رہ گیا ہے اور اُس کی انفرادیت و خصوصیت کو توہمات میں گم کر دیا گیا ہے۔ ایک مدت سے مسلم قوم نے ان اُصولوں اور نظریات کو ترک کر رکھا ہے جو اسلام نے پیش کیے تھے۔ چنانچہ اگر ایک خاص دور میں مسلم قوم نے اسلام کو اپنا لائحہ عمل بنایا تھا تو عروج بھی اس کا مقدر بنا۔ جب اُنہوں نے اس کو چھوڑ کر دوسرے نظریات اپنا لیے تو قوانینِ الٰہی کی رُو سے اُن کا زوال لازمی تھا۔ جس طرح زمین اناج اُگلتے وقت کسان کے خاندان‘ اُس کے مذہب‘ اُس کی نسل کے بارے میں سوال نہیں کرتی بلکہ فطری قوانین کی بنیاد پر اناج اُگاتی ہے‘ اسی طرح قوانینِ الٰہی کی رُو سے جو قوم بھی اسلام کے



اُصولوں پر عمل پیرا ہوتی ہے اُسے کامیابی‘ کامرانی اور دوسری قوموں پر بالادستی عطا کی جاتی ہے۔ اگر معاملہ اس کے برعکس ہو تو پھر زوال ہی اس قوم کا مقدر بن جاتا ہے۔

آج عمومی صورتِ حال یہ ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت بنیادی عبادات کو بھی انجام دینے سے قاصر نظر آتی ہے۔ ۹۵ فیصد افراد تو پنج گانہ نماز سے بھی غافل ہیں اور صرف جمعۃ المبارک کے دن دو رکعت نماز ادا کرنے پر مطمئن ہیں۔ جو ۵ فیصد افراد مسجدوں میں نظر آتے ہیں وہ بھی معاملات کے اندر ’’دینِ اسلام‘‘ کو نافذ کرنے پر تیار نہیں ہیں۔ ہر سال حج وعمرہ کرتے نظر آنے والے افراد بھی سودخوری‘ رشوت‘ ذخیرہ اندوزی کرتے ہیں۔ غریبوں اور لاچار افراد کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ بہنوں کو جائیداد سے محروم کرتے ہیں۔ اپنے ملازموں کو مزدوری کے اصل حق سے کم دیتے ہیں۔ ستم در ستم یہ کہ اب یہ سب کچھ ہمارے مزاج کا حصّہ بن چکا ہے۔ سارے معاملات غیر شرعی اور غیر اخلاقی ہیں جبکہ ہمیں اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔ جہاں حالات تنگ ہوئے وہاں بھی اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے اجتماعی توبہ کرنے کے بجائے الٹا تقدیر کا شکوہ کر دیا۔ اللہ کے دشمن غالب جبکہ مسلمان مغلوب کیوں ہیں اور آسمان سے فرشتے کیوں نہیں اُترتے‘ یہ شکوہ محض خودفریبی ہے۔ اس صورتِ حال میں کرنے کا اصل کام ’’رجوع الی اللہ‘‘ ہے اور اس کا ذریعہ قرآن کریم سے تعلق کو مضبوط کرنا ہے‘ جیسا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۠ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَاۗءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰي شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝۱۰۳﴾ (آل عمران)

’’اور تم سب مل کر اللہ کی رسّی کو مضبوطی کے ساتھ تھام لو اور آپس میں تفرقہ مت ڈالو‘ اور اللہ کا احسان اپنے اوپر یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اس نے تمہارے دلوں میں ملاپ پیدا کر دیا‘ پس اس کے فضل سے تم آپس میں بھائی بھائی بن گئے۔ اور تم تو آگ کے گڑھے کے کنارے پر تھے تو اُس نے تمہیں اس سے بچا لیا۔ اللہ تم سے یوں ہی اپنی آیتیں بیان فرماتا ہے تاکہ تم ہدایت پا جاؤ۔‘‘

رسول اللہ ﷺ نے وضاحت فرمائی کہ ’’حبل اللہ‘‘ سے مراد قرآن حکیم ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((إنَّ هٰذَا الْقُرْآنَ هُوَ حَبْلُ اللّٰهِ تَعَالٰى، هُوَ النُّوْرُ الْمُبِيْنُ وَالشِّفَاءُ النَّافِعُ، عِصْمَةٌ لِمَنْ تَمَسَّكَ بِهٖ وَنَجَاةٌ لِمَنْ تَبِعَهٗ)) (رواہ الدارمی والطبرانی)

’’بے شک یہ ’’قرآن کریم‘‘ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی مضبوط رسّی ہے‘ یہ واضح نور اور سراسر شفا دینے والا‘ نفع بخش ہے۔ اس پر عمل کرنے والے کے لیے یہ بچاؤ ہے‘ اور اس کی تابع داری کرنے والے کے لیے یہ نجات ہے۔‘‘

یہ مضمون متعدد دیگر احادیث میں بھی وارد ہوا ہے۔ داعی رجوع الی القرآن ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے ’’تعارفِ قرآن‘‘ میں بیان فرمایا ہے:

’’اہلِ ایمان کو جوڑنے والی اور بنیانِ مرصوص بنانے والی رسی یہی قرآن حکیم ہے۔ اس لیے کہ انسانی اتحاد وہی مستحکم اور پائیدار ہوگا جو فکر و نظر کی ہم آہنگی کے ساتھ ہو۔ بہت سے اتحاد وقتی طور پر وجود میں آجاتے ہیں‘ جیسے کچھ سیاسی مصلحتیں ہیں تو اتحاد قائم کرلیا‘ کوئی دنیاوی مفادات ہیں تو ان کی بنا پر اتحاد قائم کرلیا۔ یہ اتحاد حقیقی نہیں ہوتے اور نہ ہی پائیدار اور مستحکم ہوتے ہیں۔ انسان حیوانِ عاقل ہے۔ یہ سوچتا ہے‘ غور کرتا ہے‘ اس کے نظریات ہیں‘ اس کے کچھ اہداف و مقاصد ہیں‘ کوئی نصب العین ہے۔ نظریات‘ مقاصد اور نصب العین کا بڑا گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ تو جب تک ان میں ہم آہنگی نہ ہو کوئی اتحاد پائیدار اور مستحکم نہیں ہوگا۔ اس اعتبار سے اللہ کی اس رسّی کو مضبوطی سے تھاموگے تو گویا دو رشتے قائم ہو گئے۔ ایک رشتہ اہلِ ایمان کا اللہ کے ساتھ اور ایک رشتہ اہلِ ایمان کا ایک دوسرے کے ساتھ۔ جیسے کل شریعت کو تعبیر کیا جاتا ہے کہ شریعت نام ہے حقوق اللہ اور حقوق العباد کا۔ اللہ کے ساتھ جوڑنے والی سب سے بڑی عبادت نماز ہے اور بندوں کے ساتھ تعلق قائم کرنے والی شے زکوٰۃ ہے۔ اسی طرح حبلُ اللہ ایک طرف اہلِ ایمان کو اللہ سے جوڑ رہی ہے اور دوسری طرف اہلِ ایمان کو آپس میں جوڑ رہی ہے۔ یہ انہیں بنیانِ مرصوص اور ’’کَجَسَدٍ وَاحِدٍ‘‘ بنا دینے والی شے ہے۔ یہی وہ بات ہے جسے علامہ اقبال نے انتہائی خوبصورتی سے کہا ہے:

از یک آئینی مسلماں زندہ است     پیکرِ ملت ز قرآں زندہ است
ما ہمہ خاک و دلِ آگاہ اوست     اعتصامش کن کہ حبل اللہ اوست!

(وحدتِ آئین ہی مسلمان کی زندگی کا اصل راز ہے اور ملتِ اسلامی کے جسدِ ظاہری میں



روحِ باطنی کی حیثیت صرف قرآن کو حاصل ہے۔ ہم تو سرتاپا خاک ہی خاک ہیں‘ ہمارا قلبِ زندہ اور ہماری روحِ تابندہ تو اصل میں قرآن ہی ہے۔ لہٰذا اے مسلمان! تو قرآن کو مضبوطی سے تھام لے کہ ’حبل اللہ‘ یہی ہے۔)

## تمسّک بالقرآن کی صورت

قرآن کریم سے اپنے آپ کو جوڑنے کا سب سے مؤثر ذریعہ یہ ہے کہ دروسِ قرآن کی محافل میں شرکت کی جائے۔ اسی طرح اپنے گھروں میں قرآن کریم کو ترجمہ وتفسیر کے ساتھ پڑھنے پڑھانے کا اہتمام کیا جائے۔ قرآن کریم میں انبیاء کرام ؊ کے واقعات اور نافرمانی کرنے والی قوموں کا انجام اپنے بچوں کو سنائیں تاکہ ان کے اندر خوفِ خدا پیدا ہو۔ اپنی زندگی میں قرآن کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی سب سے بڑی نعمت اور رسول اللہ ﷺ کی نبوت و رسالت کی حقانیت کی زندہ نشانی جانیں۔ دین اسلام کی صداقت کی سب سے بڑی دلیل مانیں۔ اس کتاب کو اللہ ربّ العزّت کی توحید اور وحدانیت کی سب سے بڑی حُجت تسلیم کریں۔ آپ ﷺ کے معجزات میں سے ایک زندہ معجزہ تصور کریں۔ اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ ؓ کے قول ’کَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنَ ‘‘ کے مطابق ہم بھی اپنے قول وفعل اور خلق واخلاق کو قرآن کے مطابق ڈھالیں۔ ہمارے دنیاوی معمولات میں بھی قرآنی احکامات پر عمل آئے اور اس کا نورِ ہدایت ہماری زندگیوں کی ظلمت ختم کرے۔ ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کی یہ پہچان ہو کہ جب کوئی ہمیں دیکھے تو تصور کرے کہ محمد عربی ﷺ کا غلام اور اُمتی جا رہا ہے۔ اگر آج بھی مسلم قوم صحابہ کرام ؇ کا وہ جذبہ ایمانی لے کر اُٹھ کھڑی ہو‘ جس کے تحت انہوں نے قرآن حکیم کو اپنے لیے مشعلِ راہ بنایا تھا تو کوئی سبب نہیں کہ ان کو کامیابی اور کامرانی نہ ملے اور اس طرح اُخروی نجات کا حصول آسان ہو جائے۔ ہر شخص کو ’’کتاب اللہ‘‘ کے حقوق ادا کرنے کی امکانی حد تک بھرپور کوشش کرنی چاہیے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں بحیثیت اُمّتِ قرآن کریم سے وہ تعلق عطا فرمائے کہ اس کے بارے میں ہماری سستی اور کاہلی دور ہو۔ ہم بھی ایسے لوگوں میں شامل ہوں جو روزِ قیامت عرشِ الٰہی کے سائے میں ہوں گے۔ آمین یاربّ العالمین!

# عربوں کی طبقاتی تقسیم

پروفیسر حافظ محمد قاسم رضوان

ملک عرب میں زمانۂ قدیم سے حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے سام کی اولاد آباد رہی ہے۔ زمانہ کے لحاظ سے باشندگانِ عرب کو مؤرخین نے عموماً عرب بائدہ‘ عرب عاربہ اور عرب مستعربہ کے تین طبقات میں تقسیم کیا ہے۔ بعض نے عاربہ اور مستعربہ کو ایک ہی قسم قرار دے کر عرب بائدہ وعرب باقیہ دو ہی قسمیں قرار دی ہیں۔ عرب بائدہ سے وہ قومیں مراد ہیں جو سب سے قدیم زمانے میں ملک عرب کے اندر آباد تھیں اور وہ سب کی سب ہلاک ہوگئیں۔ ان کی نسل اور کوئی نشان دنیا میں باقی نہیں رہا۔ عرب باقیہ سے مراد وہ قومیں ہیں جو ملک عرب میں پائی جاتی ہیں۔ ان کے بھی دو طبقات ہیں جو عاربہ ومستعربہ کے نام سے موسوم کیے گئے ہیں۔ اسی طرح علامہ محمود آلوسی نے ابن خلدون کی کتاب ’العبر‘ کے حوالے سے عربوں کو عرب عاربہ‘ عرب مستعربہ‘ العرب التابعة للعرب اور عرب مستعجمه کے چار طبقات میں تقسیم کیا ہے۔ بہرحال زیادہ تر مؤرخین اوّل الذکر تین طبقات ہی میں تقسیم کرتے ہیں۔

## (۱) عرب بائدہ

یہ قدیم ترین باشندوں کے مختلف قبائل تھے جو تاریخی دور سے ہزاروں سال پہلے ختم ہوگئے۔ ان میں قابلِ ذکر عاد‘ ثمود‘ عمالقہ‘ طسم‘ جدیس‘ جرہم اور حضرموت وغیرہ ہیں جو کہ سام بن نوح کے چاروں بیٹوں کی نسل سے تھے‘ جن کے نام ارم‘ لاوذ‘ خلیم اور ارفخشد ہیں۔ ان قبائل میں سے کچھ کا ذکر سورۂ ق میں یوں آیا ہے:

﴿كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّاَصْحٰبُ الرَّسِّ وَثَمُوْدُ ۝١٢ وَعَادٌ وَّفِرْعَوْنُ وَاِخْوَانُ لُوْطٍ ۝١٣ وَّاَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ وَقَوْمُ تُبَّعٍ ۭ﴾

’’جھٹلایا تھا ان سے پہلے بھی نوحؑ کی قوم نے‘ کنویں والوں نے اور قومِ ثمود نے۔ اور قومِ عاد‘ فرعون اور لوطؑ کے بھائیوں نے۔ اور بن والوں اور قومِ تبع نے۔‘‘



بعض قبائل یا اقوام کی طرف نبی بھی مبعوث ہوئے جیسے قوم ثمود کی طرف حضرت صالح علیہ السلام اور قومِ عاد کی طرف حضرت ہود علیہ السلام۔ جب انہوں نے اپنے نبیوں کی دعوتِ توحید کو قبول نہ کیا تو ہلاک کر دیے گئے۔ یہ تمام قبائل مرورِ زمانہ سے نیست و نابود ہو گئے اور اب ان کا کوئی نام و نشان باقی نہیں بچا۔ ان لوگوں میں سے کئی ایک نے سلطنتیں بھی قائم کیں اور بعضوں نے مصر کو بھی فتح کر لیا تھا۔ اب اس دور کی یاد میں کچھ اساطیر‘ جاہلی عرب شعراء کے اشعار اور صحفِ آسمانی میں مندرجہ کچھ واقعات ہی باقی ہیں۔ اس کے علاوہ نجد‘ احقاف‘ حضرموت اور یمن وغیرہ میں بائدہ کے دور کی بعض عمارات کے کھنڈرات‘ پتھروں کے ستون‘ سنگ تراشیاں‘ مختلف کتبے اور دوسرے آثارِ قدیمہ ملتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ قبائل خوش حال‘ متمدن اور طاقتور تھے۔ ان میں سے عاد وثمود نے کافی شہرت حاصل کی ہے۔ قوم عاد ارضِ احقاف میں رہتی تھی جس کا شجرۂ نسب عاد بن عوص بن ارم بن سام بنتا ہے۔ عموماً عاد کو عرب کا سب سے پہلا بادشاہ کہا جاتا ہے مگر علامہ مسعودی نے لکھا ہے کہ عاد سے پیشتر اس کا باپ عوص بھی بادشاہ تھا۔ قرآن پاک میں ارم کا ذکر بھی آیا ہے مگر اس سے مراد قوم عاد ہی ہے۔ اُسی خاندان کے ایک بادشاہ جیرون بن سعد بن عاد بن عوص نے دمشق کو تاخت و تاراج کیا اور سنگِ مرمر نیز دوسرے قیمتی پتھروں سے ایک عالی شان محل بنوایا تھا جس کا نام اس نے ارم رکھا تھا۔ ابن عساکر نے بھی تاریخ دِمشق میں جیرون کا ذکر کیا ہے۔ یہ لوگ اونچی اونچی عمارتیں بنانے کے شائق تھے‘ جیسا کہ سورۃ الفجر میں بیان ہوا ہے:

﴿اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۝٦ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۝٧ الَّتِيْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ ۝٨﴾

’’کیا آپ نے دیکھا نہیں کیا کیا تھا آپ کے رب نے عاد کے ساتھ؟ وہ ارم جو ستونوں والے تھے۔ جن کے مانند نہیں پیدا کیے گئے (دنیا کے) ملکوں میں۔‘‘

اس قوم کی طرف حضرت ہود علیہ السلام بھیجے گئے‘ مگر ان کی مسلسل تبلیغ کے باوجود عاد نے نافرمانی کی راہ اختیار کی اور بادِ صرصر کے عذاب سے ہلاک ہوگئی جو کہ برابر سات راتیں اور آٹھ دن چلی۔ اس کا ذکر سورۃ الحاقۃ میں ملتا ہے۔ اب ان کے صرف کھنڈرات ہی باقی ملتے ہیں۔ بقول سید سلیمان ندوی‘ اس کا زمانہ ۲۲۰۰ ق م سے ۱۷۰۰ ق م تک ہو سکتا ہے۔ قومِ عاد کے

وطن احقاف کا علاقہ ملک یمن میں پایا جاتا ہے۔

اسی طرح قومِ ثمود کی طرف حضرت صالح علیہ السلام نبی بنا کر بھیجے گئے اور ان کی خاطر معجزانہ طور سے پہاڑ کے پتھر سے ایک اونٹنی نکالی گئی‘ مگر ان سرکشوں نے نبی کی دعوت کا انکار کیا اور اس اونٹنی کی کونچیں کاٹ ڈالیں‘ جس پر عذابِ الٰہی نے انہیں آ پکڑا اور وہ ایک زبردست چیخ یا گونج کے زیرِ اثر ہلاک ہو گئے۔ یہ لوگ مقام حجر پر رہتے تھے جسے آج کل مدائن صالح کہا جاتا ہے۔ یہ بھی بڑی بڑی عالی شان عمارتیں بنانے میں ماہر تھے اور خصوصاً پہاڑوں کو تراش کر مکان بنانا ان کا خصوصی فن تھا۔ سورۃ الاعراف میں اللہ تعالیٰ ثمود کے ذکر میں فرماتے ہیں:

﴿وَاذۡكُرُوۡۤا اِذۡ جَعَلَكُمۡ خُلَفَآءَ مِنۡۢ بَعۡدِ عَادٍ وَّبَوَّاَكُمۡ فِى الۡاَرۡضِ تَتَّخِذُوۡنَ مِنۡ سُهُوۡلِهَا قُصُوۡرًا وَّتَنۡحِتُوۡنَ الۡجِبَالَ بُيُوۡتًا ۚ﴾ (آیت ۷۴)

’’اور یاد کرو جب اُس نے تمہیں جانشین بنایا قومِ عاد (کی تباہی) کے بعد اور تمہیں جگہ دی زمین میں‘ تم اس کے نرم میدانوں میں محل تعمیر کرتے ہو اور پہاڑوں کو تراش کر (بھی اپنے لیے) گھر بنا لیتے ہو۔‘‘

قومِ ثمود کے عذاب کے ذریعے ہلاک کیے جانے کا ذکر سورۃ القمر میں ہے۔ مولانا سیّد سلیمان ندوی نے ان کا زمانہ ۱۸۰۰ ق م سے ۱۶۰۰ ق م تک لکھا ہے۔

قبیلہ طسم وجدیس کا مقام یمامہ کا علاقہ ہے۔ یہ دونوں قبائل اکٹھے رہتے تھے جبکہ بادشاہت طسم قبیلے میں تھی۔ ایک دفعہ طسم کے ظالم اور عیاش بادشاہ نے حکم دیا کہ جدیس کی کنواری لڑکیاں بیاہ سے پہلے اس کے محل میں لائی جائیں۔ اس پر جدیس کی ایک خاتون عروس نے اپنے قبیلے کو غیرت دلائی اور انہوں نے دھوکے سے طسمی بادشاہ اور امراء کو دعوت میں بلا کر ہلاک کر دیا۔ ان میں سے جو بچ گئے وہ بھاگ کر یمن کے بادشاہ کے ہاں پہنچے اور امداد کے طالب ہوئے۔ پھر وہاں سے امداد لے کر جدیس پر حملہ آور ہوئے اور تمام کو ہلاک کر دیا۔ غرضیکہ دونوں قبائل اپنی شرارت سے نیست و نابود ہو گئے۔

قبیلہ جرہم کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ جرہم اولیٰ عاد کا ہم عصر اور امم سامیہ اولیٰ سے تھا۔ جرہم اولیٰ ہی کا عرب بائدہ میں شمار ہے۔ جرہم ثانی قحطان کا بیٹا اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کا پڑوسی اور رشتہ دار تھا۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے اسی خاندان میں شادی کی اور اس سے جو اولاد



ہوئی وہ عرب مستعربہ کہلاتی ہے۔

عمالقہ نے عرب کی اُمم سامیہ اولیٰ میں سے تین ہزار قبل مسیح کے دوران عروج حاصل کیا۔ آیاتِ قرآنی‘ روایاتِ حدیث اور اشعارِ عرب میں کہیں اس کا ذکر نہیں‘ البتہ یہود کے ادب میں کثرت سے اس کا ذکر آتا ہے۔

عرب بائدہ کے دیگر قبائل کے متعلق کوئی خاص معلومات حاصل نہیں ہو سکیں۔ علامہ محمود آلوسی نے عاربہ کا شمار بھی بائدہ کے ساتھ کیا ہے اور دونوں کو عادیہ کا نام دیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ: ’’اس (ابنِ خلدون) نے اس نسل کا نام عرب عادیہ اس لیے رکھا کہ یہ لوگ عروبیت میں راسخ تھے یا اس معنی میں کہ یہ عروبیت کے بنانے والے اور اس کے موجد تھے‘ کیونکہ یہ سب سے پہلی نسل کے لوگ تھے۔ انہیں بائدہ یعنی نابود بھی کہا جاتا ہے‘ اس لیے کہ اس نسل کا کوئی فرد روئے زمین پر باقی نہیں رہا۔‘‘

## (۲) عرب عاربہ

اس طبقے کو قحطان کی اولاد سمجھا جاتا ہے۔ قحطان سے قبل حضرت نوح علیہ السلام تک کسی کی زبان عربی نہ تھی۔ قحطان کی اولاد نے ہی عربی استعمال کی اور اسے عرب بائدہ سے حاصل کیا۔ قحطانی قبائل یمنیہ اور سبائیہ کے دو حصوں میں منقسم ہیں۔ قحطان کے نسب میں علماء نے بہت اختلاف کیا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ عابد بن شاغ بن ارفخشد بن سام بن نوح کا بیٹا اور فانع ویقطن کا بھائی تھا لیکن تورات میں اس کا تذکرہ موجود نہیں۔ ہاں فانع اور یقطن کا ذکر تورات میں ہے۔

قحطان یمنی قبائل کا جدِ اعلیٰ تھا۔ تورات میں بجائے قحطان‘ یقطان (یا یقطن) مذکور ہے۔ یہ دونوں نام ایک ہی ہیں۔ تورات میں ہے کہ قحطان کے تیرہ بیٹے تھے۔ مؤرخین عرب صرف تین بیٹوں یارح‘ حضارموت اور شبا کے سوا اور کسی سے واقف نہیں۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہو گی کہ یہی تین بیٹے زیادہ مشہور تھے۔ یارح یا یعرب‘ یہ دونوں ایک ہی نام ہیں۔ یارح عبرانی تلفظ ہے جبکہ یعرب عربی۔ یہ یمن کا سب سے پہلا بادشاہ تھا۔ چنانچہ قحطان‘ یقطان اور یقطن ایک ہی شخص کے نام ہیں اور قحطانی بنی اسماعیل نہیں ہیں۔

یعرب بن قحطان کو یمن بھی کہتے تھے اور اسی کے نام سے یمن کا ملک موسوم ہوا۔ کئی ایک مؤرخین کا خیال ہے کہ یمن بن قیدار بن اسماعیلؑ کا بیٹا قحطان تھا۔ اگر قحطان حضرت اسماعیل علیہ السلام

کی اولاد ہے تو گویا تمام اہل عرب بنو اسماعیل ثابت ہوتے ہیں‘ کیونکہ عدنان اور قحطان دو ہی شخص تمام قبائل عرب کے مورثِ اعلیٰ ہیں۔ مگر جدید تحقیقات کی رو سے یہ نظریہ غلط ثابت ہو چکا ہے کہ قحطانی بنو اسماعیل سے ہیں۔

قحطانی قبائل کا اصل وطن سرزمین یمن سمجھی جاتی ہے۔ ان میں حمیری اور ازدی قبائل بہت مشہور اور نامور ہوئے ہیں۔ قبائل ازدی میں یمن اور جنوبی عرب کی حکومتیں رہیں۔ حکومت سبا کو ان کا مرکز سمجھا جاتا ہے اور ان کا لقب بھی سبا ہی تھا۔ یہ اُمم قحطانیہ کی سب سے مشہور شاخ ہے۔ انہوں نے یمن کی آبادی اور سرسبزی میں خاص طور سے بہت کوشش کی اور اسے اپنے دور کے تہذیب وتمدن کا گہوارا بنا دیا۔ انہی میں ملکہ بلقیس تھی جو کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی معاصر تھی اور جن کا واقعہ سورۃ النمل میں آیا ہے۔ سبا کی شہرت ورفعت کی داستانیں قرآن پاک‘ روایاتِ عرب‘ پہلی آسمانی کتابوں‘ مختلف آثارِ قدیمہ اور حکایاتِ یونان میں بکھری پڑی ہیں۔ یہاں کا نظامِ آب پاشی سدِ مآرب کی وجہ سے بہت ترقی یافتہ تھا اور اسی کی بدولت اس ریگ زار ملک میں سینکڑوں کوس تک بہشت زار تیار ہوگئی تھی۔ اس کا ذکر سورۂ سبا میں یوں آیا ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لِسَبَاٍ فِيْ مَسْكَنِهِمْ اٰيَةٌ ۚ جَنَّتٰنِ عَنْ يَّمِيْنٍ وَّشِمَالٍ ڛ كُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ۭ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَّرَبٌّ غَفُوْرٌ ⑮﴾

’’(اسی طرح) قومِ سبا کے لیے بھی ان کے مسکن میں ایک نشانی موجود تھی۔ دو باغات (کے سلسلے) تھے دائیں اور بائیں طرف۔ کھاؤ اپنے رب کے رزق میں سے اور اُس کا شکر ادا کرو۔ (تمہارا) شہر بہت پاکیزہ ہے اور (تمہارا) رب بہت بخشنے والا ہے!‘‘

سید سلیمان ندوی نے ’’ارض القرآن‘‘ میں سبا کے حالات سے تفصیلی بحث کی ہے۔ اراٹوس تھینس (Eratos Thenes) جو ۱۹۴ ق م میں سبا کا معاصر تھا‘ کا قول ہے کہ ’’..... سبا کے لوگ جن کا دار الحکومت شہر مآرب ہے ........ یہ قطعہ ملک مصر زیریں سے بڑا ہے۔ گرمیوں میں بارش ہوتی ہے اور دریا جاری ہوتے ہیں جو میدانوں اور تالابوں میں خشک ہو جاتے ہیں۔ اسی سبب سے زمین اس قدر سرسبز وشاداب ہے کہ تخم ریزی وہاں سال میں دو بار ہوتی ہے .... سبا کا ملک خوش وخرم ہے‘‘۔ اس اقتباس سے سبا کی سرسبز وشادابی اور زرعی حالت کا خوب اندازہ ہو سکتا ہے۔ سبائی سلطنت ایک متمدن اور متمول حکومت تھی۔ ان کے بادشاہوں



کو بڑی بڑی شاندار عمارتیں بنوانے کا خاصا شوق تھا جن کے بعض حصے عہدِ اسلام تک باقی تھے۔ کچھ آثارِ قدیمہ کی کھدائی سے اب دستیاب ہوئے ہیں۔ جب اہلِ سبا نے حکم خداوندی کی نافرمانی کی تو اللہ ربّ العزت نے ان پر سیلاب کی شکل میں عذاب نازل کیا اور وہ اکثر تباہ و برباد ہو گئے۔ یہ سیلاب سدِ مآرب کے ٹوٹنے کی وجہ سے آیا جسے عربی میں ’’سیل العرم‘‘ کہتے ہیں۔ اس کا ذکر سورۂ سبا میں ہے۔

تورات میں شبا ایک جدّ قبیلہ کا نام ہے۔ عرب روایات کے مطابق اس جدّ قبیلہ کا نام عمر یا عبد شمس اور لقب سبا تھا۔ محققین جدید بھی زیادہ تر اس کو لقب خیال کرتے ہیں۔ ان کا زمانہ ۱۱۰۰ ق م سے کم نہیں اور ازروئے کتبات ان کی آخری تاریخ ۱۱۵ ق م ہے۔ قرآن پاک کی رو سے ان کا مذہب آفتاب پرستی تھا۔ سبا کے کھنڈرات پر ہی ملوک حیرہ نے اپنی عمارت کھڑی کی اور اپنی سلطنت کو بامِ عروج تک پہنچایا۔ مؤرخین عرب کے نزدیک سبا کے دو بیٹے تھے: حمیر اور کہلان۔ حمیر تمام یمن کا مالک تھا جبکہ کہلان کو اطراف وحدود کی پاسبانی سپرد تھی۔ بنو کہلان کے سردار قبیلہ نے خواب دیکھا یا کسی کاہن سے سنا کہ سدِ مآرب ٹوٹے گا اور سلطنتِ سبا برباد ہو جائے گی۔ اس بنا پر وہ یمن چھوڑ کر حجاز‘ نجد‘ بحرین‘ عمان‘ یمامہ‘ مدینہ‘ عراق اور شام چلے گئے۔

درحقیقت حمیر‘ سبا سے الگ کوئی شے نہیں۔ صرف خاندان اور موقع حکومت کا فرق ہے۔ زبان‘ مذہب اور تہذیب وتمدن ایک ہی ہیں۔ خود زمانۂ حال میں دریافت شدہ حمیری دور کے کتبوں میں حمیر کی بجائے سبا مذکور ہے۔ البتہ مؤرخین یونان نے ۲۰ ق م میں اور اہلِ حبشہ نے چوتھی صدی عیسوی میں ان کو اپنے کتبوں میں حمیر یا ارض حمیر کہا ہے۔ حمیر عربی اور حبشی میں حمر سے مشتق ہوگا‘ جس کے معنی سرخ کے ہیں اور محاورے میں گورے رنگ کو احمر کہتے ہیں۔ اس کا مقابل اسود ہے۔ عرب سیاہ وسپید کی جگہ الاسود والاحمر بولتے ہیں۔ عرب اہلِ حبش کو اسود اور اسودان کہتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں اہل حبش عربوں کو حمیر یعنی گورے رنگ کے آدمی کہتے ہوں گے۔ حمیر کی تاریخ پہلی صدی ق م اوسط سے شروع ہو کر ۵۲۵ء پر ختم ہوتی ہے اور کل زمانہ ۵۵۰ برس ہے۔

سلاطین حمیر کے دور میں تہذیب وتمدن اپنے پورے کمال پر تھا۔ بنو کہلان میں سے ثعلبہ بن عمرو حجاز کی جانب نکل گئے اور مدینہ میں اپنی حکومت قائم کر لی۔ خزاعہ نے مکہ کی طرف توجہ کی

اور وہاں پر آباد قبیلہ جرہم کو شکست دے کر قابض ہو گئے۔ نصر بن ازد تہامہ کے علاقہ میں آباد ہوا۔ خزاعہ کا ایک بیٹا عمان کی طرف جا کر آباد ہوا اور اس کی اولاد ازدعمان کے نام سے منسوب ہوئی۔ دوسرا غسان شام کی سرحد پر جا کر ٹھہرا اور سرحدی قبائل کو محکوم بنا کر اپنی حکومت قائم کر لی۔ لخم کی اولاد میں سے منذر اور اس کے بیٹے حیرہ کے علاقے میں جا کر قابض ہو گئے۔ انہی میں سے ملوک غسان اور حیرہ کی سلطنتیں مشہور و معروف ہوئیں۔ غسانی سلطنت روم کے باج گزار تھے اور حیرہ والے ملک فارس کے تابع تھے۔ اسلامی دور میں دیگر حکومتوں کے ساتھ یہ بھی ختم ہو گئیں اور ساتھ ہی یمن کی ولایت بھی اپنے انجام کو پہنچی۔ ظہورِ اسلام کے وقت تمام قحطانی قبائل خوب طاقتور اور سارے ملک عرب پر چھائے ہوئے تھے۔

مؤرخین کی عام تقسیم سے عاد و ثمود کی قومیں عرب بائدہ میں داخل ہیں، لیکن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی ایک روایت کے مطابق عرب عاربہ کی تاریخ ارم کے زمانے سے شروع ہوتی ہے اور وہ دس جماعتیں تھیں: عاد، ثمود، طسم، جدیس، عمالیق، عبیل، امیم، دبار، جاسم اور قحطان۔ اس روایت کی بنا پر عرب بائدہ میں وہ قومیں ہوں گی جن کا زمانہ عادِ ارم سے بھی پہلے تھا۔ عادِ اولیٰ کا ذکر قرآن پاک میں ہے۔ اس صورت میں تسلیم کرنا ہو گا کہ عادِ اولیٰ پہلے لوگ تھے اور عادِ ارم دوسرے۔ حضرت ہود علیہ السلام عادِ ارم کی طرف مبعوث ہوئے اور ان کا زمانہ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے کے بعد تھا، لیکن عادِ اولیٰ کا زمانہ اس سے پہلے کا ہو گا۔ یہ روایت شاذ کے درجہ میں ہے۔ عام فیصلہ وہی ہے جو اوپر مذکور ہے۔ یمن کی تبابعہ کی حکومتیں بھی بنوقحطان سے تھیں۔ قحطان کے دوسرے بیٹے حضار موت نے عرب کے جس حصے کو اپنا مسکن بنایا وہ حضر موت کے نام سے آج تک مشہور ہے اور عرب کے جنوب میں بحیرہ عرب پر واقع ہے۔

علامہ محمود آلوسی نے اس دوسرے طبقے کو عرب مستعربہ شمار کیا ہے جو کہ حمیر بن سبا کی اولاد سے تھے۔ انہیں عرب مستعربہ اس لیے کہا گیا کہ جب عربیت کی علامات اور امتیازی نشان پہلے لوگوں سے منتقل ہو کر ان میں آئے تو یہاں ان چیزوں نے ''صیرورت'' کا خاصہ اختیار کر لیا۔ یعنی ان لوگوں نے وہ صورت اختیار کر لی جو ان سے پہلے کے ہم نسب لوگوں میں نہ تھی کہ انہوں نے عربی زبان بولنی شروع کر دی۔ لہٰذا مستعربہ کا لفظ باب استفعال میں بمعنی صیرورت (ایک حالت سے منتقل ہو کر دوسری حالت میں چلے جانا) ہے۔ چنانچہ عربوں کا محاورہ ہے کہ اِسْتَنْوَقَ



الْجَمَلُ اور اِسْتَحْجَرَ الطِّیْنُ وغیرہ۔ چونکہ پہلے طبقے کے لوگ نسلی اعتبار سے تمام قوموں سے قدیم تر تھے لہٰذا عربی زبان اصالتاً انہی کی زبان تھی اور انہی کو عاربہ کہا گیا تھا۔ گویا دوسرے طبقے کو عربی زبان بولنے کی وجہ سے مستعربہ کی بجائے عاربہ ہی کہنا چاہیے۔

## (۳) عرب مستعربہ

اس طبقہ سے مراد بنوعدنان یا اولاد حضرت اسمٰعیل علیہ السلام ہیں۔ یہ لوگ ملک عرب میں باہر سے آ کر آباد ہوئے، اس لیے ان کو عرب مستعربہ یا مخلوط عرب کا نام دیا گیا۔ عرب کا بڑا حصہ اسی خاندان سے ہے اور اسی سلسلہ سے اسلام کی تمام تر تاریخ وابستہ ہے، کیونکہ قریش کا قبیلہ اور حضور ﷺ کی پیدائش اسی طبقہ میں ہے۔ یعرب بن قحطان کو یمن کا ملک ملا تھا اور اس کے دوسرے بھائی جرہم ثانی بن قحطان کے حصے میں ملک حجاز آیا تھا۔ اس لیے بنوجرہم وادی مکہ میں آ کر آباد ہو گئے۔ تقریباً ۲۲۰۰ ق م میں جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بی بی ہاجرہ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو کعبہ کے مقام پر لا کر بسایا تو یہ قبیلہ حوالی مکہ میں آباد تھا۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے انہی میں شادی کی اور وہاں سے جو اولاد چلی وہ عرب مستعربہ کہلائی۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی عمر پندرہ سال تھی کہ ان کی والدہ حضرت ہاجرہؓ کا انتقال ہو گیا۔ والدہ کے فوت ہونے کے بعد حضرت اسماعیل علیہ السلام نے ارادہ کیا کہ مکہ سے شام کی طرف کسی مقام پر چلے جائیں۔ قبیلہ جرہم نے آپس میں مشورہ کر کے ان کو اس ارادہ سے باز رکھا اور ان کا نکاح عمارہ بنت سعید بن اسامہ بن اکیل سے خاندان عمالقہ میں کر دیا۔ چند روز کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام اس طرف تشریف لائے اور ان کے اشارہ کے موافق حضرت اسماعیل علیہ السلام نے اس بی بی کو طلاق دے کر قبیلہ جرہم میں سیدہ بنت مضاض بن عمرو سے نکاح کر لیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان عجمی یا فارسی تھی مگر جب حضرت اسماعیل علیہ السلام کی بنوجرہم میں شادی ہوئی تو آئندہ سے آل اسماعیلؑ کی زبان عربی قرار پائی، کیونکہ خود بنوجرہم کی زبان یہی تھی۔

مستعربہ اسماعیل علیہ السلام کی اولاد ہیں، جو تقریباً انیسویں صدی قبل مسیح میں حجاز آ کر ٹھہرے اور شاہانِ جرہم سے دامادی کا رشتہ جوڑ کر وہاں مستقل اقامت اختیار کر لی۔ یہاں ان کی نسل بکثرت پھیلی جسے زمانے کے تاریک گوشوں نے اپنے اندر اس طرح چھپا لیا کہ اب تاریخ بھی یقینی شکل میں عدنان سے اوپر کوئی صحیح نسب نامہ نہیں بتاتی۔ چنانچہ عربی نسل کا صحیح سلسلہ نسب

عدنان پر ہی ختم ہو جاتا ہے۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی کئی ایک اولادوں میں سے قیدار بھی تھے جن سے عرب مستعربہ کا سلسلہ چلتا ہے۔ یہی عدنانی بھی کہلاتے ہیں‘ جو قیدار بن اسماعیلؑ کی چالیسویں پشت میں تھے اور ان کا زمانہ چھٹی صدی قبل از مسیح تھا۔ اس کے بعد ارشادِ الٰہی کے مطابق حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام نے خانہ کعبہ کی تعمیر کا کام شروع کیا اور اس کے مکمل ہونے پر حضرت جبریل علیہ السلام کی ہدایت کے مطابق حجر اسود کو اپنے مقام پر نصب کیا گیا۔ خانہ کعبہ کی تعمیر کا ذکر سورۃ البقرۃ میں یوں آیا ہے:

﴿وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ۭ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ١٢٧﴾

’’اور یاد کرو جب ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ ہمارے گھر کی بنیادوں کو اُٹھا رہے تھے۔ اے ہمارے ربّ! ہم سے یہ خدمت قبول فرمالے‘ یقیناً تو سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔‘‘

جس پتھر پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ کی تعمیر کا کام سرانجام دیا اسے ’’مقامِ ابراہیم‘‘ کہتے ہیں اور یہ آج بھی مسجد حرام میں موجود ہے۔ تعمیر کے کام کے دوران حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی اولاد کے لیے دعا بھی کرتے تھے جس کا اثر آج بھی عرب میں ظاہر ہے اور ان کی ترقی و خوش حالی اسی کی رہین منت ہے۔ خانہ کعبہ کی تعمیر کے بعد خداوند تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو اس کی طرف حج کے لیے بلائیں۔ ان کی برکت سے اس زمانے سے آج تک حج کا سلسلہ جاری ہے‘ اور ان شاء اللہ قیامت تک جاری رہے گا۔ لوگوں کو حج کروانے کے بعد حضرت ابراہیمؑ ملک شام کی طرف چلے گئے اور اپنی وفات تک ہر سال خانہ کعبہ کی زیارت اور حج کو آتے رہے۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی وفات بروایت تورات ایک سو سینتیس سال کی عمر میں ہوئی۔

آپ کے بارہ بیٹوں کی نسل نے اس قدر ترقی کی کہ مکہ میں نہ سما سکے اور تمام ملک حجاز میں پھیل گئے۔ کعبہ کی تولیت اور مکہ معظمہ کی سیادت مسلسل بنی اسماعیل سے متعلق رہی۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے بیٹے قیدار کی اولاد میں ایک شخص عدنان ہوئے۔ عدنان کی اولاد بنی اسمٰعیل کے تمام مشہور قبائل پر مشتمل ہے اور اسی لیے عرب مستعربہ بنی اسماعیل کو عدنانی یا آلِ عدنان کہا جاتا ہے۔



عدنان کے بیٹے کا نام معد اور پوتے کا نام نزار تھا۔ اسی لیے عدنانی قبائل کو معدی اور نزاری بھی کہتے ہیں۔ نزار کے چار بیٹے تھے جن سے تمام عدنانی قبائل متفرع ہوئے۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی وفات کے بعد کعبہ کی تولیت ان کے بڑے لڑکے ناہت کو ملی۔ ان کے انتقال پر یہ منصب ان کے نانا حلیل کے ہاتھ میں آیا۔ گویا کعبہ کی تولیت بنو اسمٰعیل سے نکل کر بنو جرہم کے ہاتھ میں آ گئی۔ جب قبیلہ خزاعہ وہاں پہنچا تو اس نے اس منصب پر قبضہ جما لیا۔ آخر کار قُصی بن کلاب قریشی نے اپنا یہ حق بنو خزاعہ سے واپس حاصل کیا۔

رہی یہ بحث کہ لفظ ’’عرب‘‘ کا تورات اور قرآن پاک وغیرہ میں ذکر نہیں ہے‘ بلکہ تورات میں اوّلاً مدبار اور قرآن میں ’’وادی غیر ذی زرع‘‘ کا ذکر آیا ہے‘ تو درحقیقت عرب‘ حجاز‘ مکّہ‘ کعبہ جیسے تمام الفاظ بعد میں بنے ہیں۔ اسی لیے تورات نے مدبار یعنی بامیہ اور قرآن نے وادی غیر ذی زرع (بے آب و گیاہ سرزمین) کا لفظ استعمال کیا ہے‘ کیونکہ اس کے سوا اس وقت کوئی دوسرا نام نہ تھا۔ اب لفظ عرب کے لغوی معنی بھی بادیہ اور صحرا کے ہیں۔ گویا مدبار‘ وادی غیر ذی زرع اور عرب ہم معنی الفاظ ہیں۔

عدنان کے پوتے نزار سے چار مشہور قبیلے ایاد‘ انمار‘ ربیعہ اور مضر ہیں۔ ربیعہ اور مضر زیادہ نامور اور ایک دوسرے کے مدمقابل تھے۔ ربیعہ کی شاخیں عبدالقیس اور وائل ہیں۔ وائل کی دو شاخیں بکر و تغلب ہیں۔ بکر کی تین شاخیں عجل‘ حنیفہ اور شیبان ہیں۔ آخر الذکر کی ایک شاخ سدوس ہے۔ مضر کی اولاً دو شاخیں ہیں: بنوقیس عیلان اور بنو یاس جنہیں بنو حندف بھی کہتے ہیں۔ بنوقیس کی شاخیں عدوان‘ غطفان‘ سلیم اور ہوازن وغیرہ ہیں۔ غطفان کی دو شاخیں ذبیان و عبس ہیں۔ بنو یاس کے مشہور قبائل ہذیل‘ کنانہ‘ اسد‘ ضبہ‘ مزینہ اور تمیم وغیرہ ہیں۔ کنانہ کی اولاد سے قریش ہیں۔ قریش کا لقب سب سے پہلے بعض کے نزدیک نصر بن کنانہ اور دوسروں کے نزدیک فہر کو ملا۔ حافظ عراقی کا مشہور شعر ہے ؎

اما قریش فالاصح فهر — جماعها والاکثرون النضر

قریش کی اولاد سے کئی قبائل ہوئے جن میں مشہور بنی جمح‘ بنی سہم‘ بنی مخزوم‘ بنی تیم‘ بنی عدی‘ بنی زہرہ‘ بنی عبدالدار اور بنی عبد مناف ہیں۔ عبد مناف کے چار بیٹے عبد شمس‘ نوفل‘ مطلب اور ہاشم تھے۔ عبد شمس کے بیٹے امیہ تھے جن کی اولاد بنو اُمیہ کے نام سے مشہور ہوئی۔ ہاشم کے بیٹے

عبدالمطلب (شیبہ) تھے جن کے دس بیٹوں میں سے عبداللہ (آنحضرت ﷺ کے والد ماجد) تھے۔ دوسرے بیٹے حضرت عباس ؓ کی اولاد میں سے خلفائے بنوعباسیہ ہوئے۔ تیسرے بیٹے ابوطالب تھے جو حضرت علی ؓ کے پدر بزرگوار تھے۔ ان کی اولاد آگے علوی کہلائی۔

بنوقحطان کی ایک شاخ خزاعہ نے عدنانیوں کو مکہ سے نکال دیا تھا۔ یہ عدنانی قبائل مختلف اطراف میں پھیل گئے۔ بنی بکر بحرین پہنچے۔ بنی حنیفہ یمامہ جا بسے۔ بنی تغلب نے فرات کے کنارے ڈیرا ڈالا۔ بنی تمیم دجلہ اور فرات کے دہانہ پر آباد ہوئے۔ بنی سلیم نے مدینہ کے قرب و جوار میں سکونت اختیار کی اور بنوثقیف نے طائف کی راہ پکڑی۔ بنی اسد کوفہ کے مغرب میں بود و باش کرنے لگے۔ مکہ معظمہ کے گرد صرف قبائل قریش رہ گئے جو بڑی حد تک پراگندہ تھے۔ قُصَی بن کلاب نے سب کو متحد و متفق کیا۔ ان کے زمانے تک بنی خزاعہ حرم مکہ کے متولی تھے مگر ان کی شادی حلیل خزاعی کی دختر سے ہوئی۔ حلیل کے مرنے پر اس کی وصیت کے مطابق مکہ کی تولیت قُصَی کے ہاتھ میں آ گئی۔ اس طرح دوبارہ قحطانیوں کی بجائے عدنانیوں کا حرم میں عمل دخل ہو گیا۔ قُصَی نے ایک انجمن مشاورت کی بنیاد ڈالی جس کا نام ''دار الندوہ'' رکھا اور اپنے مکان کا ایک کمرہ اس کے لیے مخصوص کیا۔ یہاں بیٹھ کر قُصَی کاروبارِ حکومت چلاتے اور قریش کے تمام امور یہیں سرانجام پاتے۔ قُصَی کی امداد کے لیے بزرگانِ قریش کی ایک مجلس مشاورت موجود تھی۔ ہر قسم کی تقریبات بھی یہیں منعقد ہوتیں۔ قُصَی نے ہی سقایہ اور رفادہ کے مناصب قائم کیے۔ حاجیوں کو پانی پلانے کے لیے بڑے بڑے حوض بنوائے۔ قریش کو مجبور کیا کہ وہ حج کے موقع پر تین دن تک حاجیوں کو کھانا کھلائیں اور اس کے اخراجات کے لیے تمام لوگ باہمی چندہ کریں۔ غرضیکہ قُصَی کا مکہ اور حجاز میں دینی اور دنیوی دونوں قسم کا اقتدار قائم ہو گیا۔

قُصَی کی وفات کے بعد اس کا بیٹا عبدالدار مکہ کا حاکم تسلیم کیا گیا۔ عبدالدار کی وفات کے بعد اس کے پوتوں اور اس کے بھائی عبدمناف کے بیٹوں میں حکومت کے لیے جھگڑا پیدا ہو گیا۔ قریب تھا کہ جنگ چھڑ جائے لیکن مکہ کے بااثر لوگوں نے بیچ میں پڑ کر فیصلہ کیا کہ خدماتِ حرم کے مناصب کو آپس میں تقسیم کر لیا جائے۔ یوں تولیت کعبہ، لواء اور دار الندوہ بنی عبدالدار کے حصہ میں آئے جبکہ سقایہ و رفادہ ہاشم کو ملے۔ عبدمناف کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے چاہِ زمزم کو جو کہ ریت کے ایک تودے میں چھپ گیا تھا، دوبارہ کھوج کر کھدوایا اور اس کی مرمت کروائی۔ ہاشم نے بھی اپنے فرائض نہایت عمدگی سے انجام دیے۔ آہستہ آہستہ انہیں حکومت کے کچھ اور حقوق بھی حاصل ہو گئے۔ اپنی دولت اور سخاوت کی وجہ سے آپ مکہ میں ہر دلعزیز تھے۔ قریش میں تجارت عام کرنے اور اس کے تمام ممکنہ ذرائع پیدا کرنے سے انہیں بہت فائدہ پہنچایا۔ قیصر روم سے یہ رعایت حاصل کی کہ قریش کے قافلہ سے ٹیکس حاصل نہیں کیا جائے گا۔ آگے آپ کے بھائی عبدشمس اور بیٹے عبدالمطلب کی اولاد ہی مشہور و معروف ہوئی۔

علامہ آلوسی نے اس تیسرے طبقے کو ''العرب التابعة للعرب'' کے نام سے ذکر کیا ہے۔ اس میں انہوں نے ملوکِ حیرہ، ملوکِ کندہ اور عربوں کی اس بدوی حکومت کا ذکر کیا ہے جو شام کے علاقے بلقاء میں بنی جفنہ کے ہاں قائم تھی۔ پھر مدینہ میں اوس و خزرج کی سیادت کا ذکر ہے۔ اس کے بعد عدنان، ان کے انساب اور مکہ میں عمل پیرا قریش کی حکومت کی تفصیل ہے۔ آخرکار اس عظیم نبوتِ محمدی ﷺ کا ذکر ہے جس کی بدولت اللہ تعالیٰ نے ان عربوں اور تمام اُمّتِ محمدی کو شرف بخشا۔ گویا اس طبقے کو العرب التابعة للعرب کہنے کی وجہ ظاہر ہے۔

عربوں کے ایک چوتھے طبقے ''عرب مستعجمہ'' کی مشرق و مغرب میں بدوی حکومت تھی۔ ان کا یہ نام اس لیے رکھا گیا کہ جس مضری زبان میں قرآن مجید نازل ہوا تھا اور جو ان کے اسلاف کی زبان تھی، یہ اس سے ہٹ گئے تھے اور ان کی زبان میں عجمیت آ گئی تھی۔

## مصادر و مراجع


(۱) تاریخ اسلام، از مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی

(۲) بلوغ الارب فی احوال العرب، از علامہ محمود آلوسی، مترجم پیر محمد حسن

(۳) ارض القرآن، از سید سلیمان ندوی

(۴) ادب العرب، از زبید احمد

(۵) اصح السیر، از مولانا عبدالرؤف دانا پوری

(۶) تاریخ ادب العربی، از احمد حسن زیات، مترجم عبدالرحمٰن طاہر سورتی ❁❁❁



قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت و تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

داعیٔ رجوع الی القرآن، بانیٔ تنظیم اسلامی

محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

# بیانُ القرآن

ترجمہ و مختصر تفسیر

- خوبصورت قرآنی رسم الخط
- تفسیری سائز
- عمدہ امپورٹڈ کاغذ
- معیاری طباعت
- دیدہ زیب ٹائٹل
- مضبوط مراکو جلد

2560 صفحات پر مشتمل، چار جلدوں میں

مکمل سیٹ کی قیمت: 9600 روپے

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور

36-K، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)





Jan. 2025
Vol.74

Regd. CPL No.115
No.1

Monthly Meesaq Lahore